وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (طٰهٰ)

شاہراہِ علم

(جامعہ کا پیغام طلبائے مدارس اسلامیہ کے نام)

زیر سرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہ العالی

مدیر: ابوحمزہ

محرم الحرام، صفر المظفر، ربیع الاوّل ۱۴۲۸ھ

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر، ۴۲۵۴۱۵

وَ قُلْ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ)

شاہراہِ علم

(جامعہ کا پیغام طلبائے مدارس اسلامیہ کے نام)

زیر سرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہ العالی

مدیر: ابوحمزہ نائب مدیر: ابوعبدالفتاح

معاون: ابوالنصر حکیم فخرالاسلام الہ آبادی

جلد	:	۴
شمارہ نمبر	:	۳۵،۳۴،۳۳
ماہ	:	محرم الحرام، صفرالمظفر، ربیع الاوّل ۱۴۲۸ھ
زرِتعاون	:	سالانہ ۵۰/روپئے۔خارج از جامعہ ۱۰۰/روپیہ

ترسیل زر کا پتہ

"دفتر شاہراہ علم"

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر، ۴۲۵۴۱۵

فہرست مضامین

مضامین		صفحات
اداریہ	ابوحمزہ دستانوی	۳
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہر طبقہ بشری۔۔۔۔۔	ابوحمزہ دستانوی	۶
نصاب تعلیم کی سمیت	فخر الاسلام الہ آبادی	۲۴
سائنس اور اسلام: سمجھا انہوں نے نیچر و تدبیر کو خدا	فخر الاسلام الہ آبادی	۲۷
سائنس اور اسلام: ''ارتقاء ایک فریب''	فخر الاسلام الہ آبادی	۴۳
سائنس اور اسلام: (حضرت تھانویؒ اور مفتی محمد تقی)۔۔	فخر الاسلام الہ آبادی	۵۶
سائنس اور اسلام: (باہمی نسبت۔ذریعہ اور مقصود کا فرق)	فخر الاسلام الہ آبادی	۶۳
سیکولر تعلیم اور مسلمان: (مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ)	فخر الاسلام الہ آبادی	۷۷
انسانیت کا سکون نہ اشتراکی نظام میں ہے نہ سیکو۔۔۔	فخر الاسلام الہ آبادی	۱۰۸
انٹرنیشنل میچ: وَن ڈے اینڈ فائیو ڈے	فخر الاسلام الہ آبادی	۱۳۲
دورِ حاضر میں دینی تعلیم کی صورتیں	مولانا فیض الرحمٰن عثمانی	۱۳۴
اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے	مولانا افتخار صاحب بستوی	۱۴۳
امام ابوحنیفہؒ اور ان کی فقہ	الشیخ محمد سلیمان شمسیؒ	۱۴۸

کمپوزنگ: منسلک طلبائے جامعہ کمپیوٹر ایجوکیشن سینٹر اکل کوا
فریمنگ اینڈ سیٹنگ: محمد مہر علی قاسمی (دھنباد، جھارکھنڈ)

اداریہ:

موجودہ اور آئندہ نسلوں کو الحاد و بے دینی سے کیسے بچایا جائے؟

اللہ رب العزت نے سورۂ یوسف میں ارشاد فرمایا:

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۰

حضرت یوسف علیٰ مبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ جس کو قرآن نے خود احسن القصص کہا اور مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن نے ایک ہی جگہ پر ترتیب کے ساتھ اگر کسی واقعہ کو ذکر کیا تو وہی ہے ورنہ دیگر واقعات کو مختلف مقامات پر حسب ضرورت وسیاق وسباق ذکر کیا اور قرآن کا یہ دستور اور طریقہ رہا کہ وہ قصص واقعات کو تمام جزئیات کے ساتھ بیان نہیں کرتا بلکہ واقعات کے ان پہلوؤں کو بیان کرتا ہے، جس میں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی عبرت یا سبق ہو۔ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کے واقعہ کو لیجئے باوجود ترتیب ملحوظ رکھنے کے بہت سی جزئیات اور پہلوؤں کے ذکر کی قرآن نے ضرورت محسوس نہیں کی، لہٰذا معلوم ہوا کہ جو کچھ بیان کیا گیا، وہ امت کے لیے ازحد ضروری اور مفید ہے۔ اب اسی کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے قصۂ یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام میں تاویل کے بعد تدبیر کو بیان کرنا یہ کہہ کر ”فذروہ فی سنبلہ“ اس میں یہ درس اور نصیحت پوشیدہ ہے کہ عالم اور فقیہ چوں کہ وارث انبیا ہیں، لہٰذا وہ صرف پیش آمدہ مسئلہ کا جواب ہی فراہم کردیں اور یہ سمجھیں کہ میری ذمہ داری پوری ہوگئی صحیح نہیں، بل کہ مسئلہ کو بیان کرنے کے بعد اگر وہ حرام ہے تو تدبیر بھی بیان کریں کہ اس کا صحیح حل اصول فقہ وشریعت کی روشنی میں یہ ہے، تاکہ امت کو محرمات سے بچایا جاسکے، جب یوسف علیہ السلام ظاہری ہلاکت سے جس کو ہلاکت جسدی یا جسمی کہا جاوے بچانے کی تدبیر بیان کررہے ہیں تو باطنی یعنی فکری واعتقادی ہلاکت سے بچانا بدرجۂ اولیٰ واجب اور ضروری ہوجاتا ہے، الحمدللہ ہمارے علما نے اس ذمہ داری کو پوری طرح نبھایا اور نبھارہے ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک نبھاتے رہیں گے۔

اسلام ایک کامل ومکمل دین ہے۔ دنیا میں پیش آنے والے ہر مسئلہ کا حل اور وہ بھی

صحیح حل آپ کو شریعت محمدیہ میں ضرور بالضرور مل جائے گا چاہے اس مسئلہ کا تعلق سیاست سے ہو معیشت سے ہو یا معاشرت سے یا زندگی کے کسی اور شعبہ سے ہو الحمدللہ چودہ سو سالہ تاریخ اس پر گواہ ہے احوال زمانہ کتنی ہی کروٹ کیوں نہ بدلیں دنیا کتنی ہی سپر فاسٹ کیوں نہ ہو جائے انسان سیارہ ارض سے نکل کر کسی اور سیارہ پر بھی کیوں نہ پہنچ جائے مگر اسلام اور شریعت محمدیہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اس میں ہر زمانہ میں پنپنے کی طاقت ہے انقلاب دہر سے اس میں کسی طرح کی غلط تحریف اور ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں اور تا قیامت اس کی یہی کیفیت اور صورت حال رہے گی انشاء اللہ۔

امت محمدیہ صنعتی انقلاب کے بعد جن بہت سارے حالات سے دوچار ہوئی ان میں سے ایک سیکولر تعلیم یا انگریزی تعلیم بھی ہے۔ انگریز جس کو قرآن نے اہل کتاب یہود و نصاریٰ سے تعبیر کیا ہے اسلام کا عدو مبین ہے، آغاز اسلام ہی سے وہ اسلام کے استحصال کی انتھک کوششوں میں مصروف ہے اولاً تو اس نے صاحب شریعت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ، حبیب کبریا، سید الانبیا، امام الاتقیاء، خاتم النبیین والمرسلین کو ابتدائی دور ہی میں قتل کرنے کی ناکام کوشش کی پھر اہل باطل کفار و مشرکین کے ساتھ مل کر بزورِ شمشیر مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنے اور ان کو نیست و نابود کرنے کی تدبیر اور سازشیں رچیں مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ تو اس نے میدان کارزار کو چھوڑ کر ایک نئی سازش کا آغاز کیا اور وہ تھی مسلمانوں کو صحیح اسلامی تعلیمات سے دور کر دیا جائے تاکہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی مسلمان نہ رہیں جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد قبائل عرب کے ان لوگوں کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ کر سکے تھے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات سے کچھ مدت پہلے ہی اسلام میں داخل ہوئے تھے منع زکوٰۃ یعنی زکوۃ سے انکار پر آمادہ کیا۔ یہ ضعیف الایمان نئے مسلمان ان کے جال میں پھنس گئے اور زکوۃ کا انکار کر بیٹھے مگر اللہ رب العزت بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے خلیفۃ الرسول بلافصل ابوبکر الصدیقؓ پر کہ انہوں نے اس کو قبول نہ کیا انہیں سمجھایا اور ان سے جہاد کیا یہاں تک وہ اپنی اس حرکت سے باز آگئے اور اس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اصول ایمان میں ترمیم اور تبدیلی کے دروازے کو قیامت تک کے لیے بند کر دیا، ورنہ عیسائیت کی طرح اسلام کو بھی مسخ کر دیا جاتا اور آج تک پتا نہیں اسلام کی کیا صورت حال ہو چکی ہوتی۔ لیکن الحمد ایک طرف اللہ کا وعدہ:

إنّا نحن نزلنا الذّكر و إنّا لهٗ لحافظون تھا اور دوسری طرف ہر زمانہ میں ایسے فتنوں کو کچلنے کے لیے ابوبکر کی غیرت اور حوصلہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی کھڑا ہوتا رہا اور انشاء اللہ قیامت تک ہوتا رہے گا۔

اسلام کو نابود کرنے کی دوسری کوشش جھوٹے نبیوں کو کھڑا کرنا جیسے دورابی بکر میں مسیلمہ ابن الحبیب کذاب، طلیحہ ابن خویلد الاسدی، اسود العنسی، سجاح بنت حارث، ذوالتاج لقیط ابن توبرہ اللہ غریق رحمت فرمائے ابوبکر صدیقؓ، خالد ابن ابولید، عکرمہ ابن ابی جہل، مہاجر ابن ابی امیہ، خالد بن سعید، عمرو ابن عاص، حذیفہ ابن محصن، عرفجہ ابن ہرثمہ، شرحبیل ابن حسنہ، معن ابن حاجز، سوید ابن مقرن، علاء ابن الحضرمی، عتاب ابن اسید زید ابن الخطاب، عتبہ ابن ربیعہ مجاعۃ ابن مرارۃ، براء ابن مالک، ثابت بن شماس، ضرار ابن ازو ابوقتادہ، حارث ابن ربعی، عکاشہ ابن محصن، سلیط بن قیس، معتصم ابن نویرہ، وحشی ابن حرب، ابودجانہ انصاری، ام عُمارہ نسیبہ بنت کعب انصاریہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو انہوں نے ان مدعیان نبوت کا قلع قمع کردیا اور فتنہ ارتداد کو جڑ سے اکھاڑ دیا اور اس طرح اسلام کو ختم کرنے کی، اہلِ کتاب کی اس سازش کو ناکام کردیا، جو انہوں نے عیسائیت کی طرح اسلام پر آزمائی تھی۔ اللہ ہمارے ان تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی قبروں کو نور سے بھردے اور ہمیں تہذیبی ارتداد کے اس دور میں ان کی سی ہمت عطا فرمائے اور ساتھ ساتھ کامیابی بھی جیسی آپ نے ان کو عطا کی اور ان کو اور ہم کو اس کا بہترین بدلہ اپنی رضامندی کی صورت میں عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

عمر ابن الخطاب اہل کتاب کی سازشوں کو خوب اچھی طرح جان چکے تھے، لہٰذا آپ نے ان کو جزیرۃ العرب سے باہر کردیا جب ان سے کچھ نہ بن پڑا تو ابولولؤ مردود کے ذریعہ آپ کو شہید کروادیا اور اب مطمئن ہوچکے تھے اور اسلام ختم کردیا جائے گا مگر ان اللہ لایخلف المیعاد۔ یہ مسلمان کا عقیدہ ہے الحمدللہ تب بھی اسلام ختم نہیں ہوا اور اب بھی انشاءاللہ نہیں اور قیامت تک نہیں ہوگا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں نفاق کا لبادہ پہن کر انہوں نے پھر اسلام پر ایک زوردار حملہ کیا اور خوارج وروافض کو عبداللہ ابن سباء نے یہودیانہ افکار دے کر کھڑا کیا مگر الحمدللہ حضرت عثمان نے بھی جرأت واستقامت کا مظاہرہ کیا یہاں تک شہید کردیئے گئے

مگر اپنے موقف سے دست بردار نہ ہوئے اور امت کو درس دے دیا کہ صاحب حق جان تو دیدے مگر اپنے حق سے دست بردار نہ ہو۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اولاً خوارج نے سر اٹھایا ان کو تو آپ نے مقام نہاوند پر اور مناظرات میں عبداللہ ابن عباس کے ذریعہ شکست فاش دی، ثانیاً روافض نے سر اٹھایا آپ نے ان کو بھی ملک بدر کر دیا، اور یوں امت کو درس دیا کہ دین اسلام میں کسی طرح کتر بیونت کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور سختی سے ایسے مفریطین سے نمٹا جائے گا آپ کے بعد حضرت امیر معاویہ بھی ان سے ایسی سختی کے ساتھ پیش آتے رہے اور دین اسلام کو ہر طرح کی تحریف سے بچاتے رہے۔ **فللہ الحمد علی ذالک!**

پھر خلافت بنو امیہ کے دورِ عبدالملک میں قدریہ اور جبریہ نے سر اٹھایا تو حضرت عبداللہ ابن عمر نے لوگوں کو متنبہ کیا اور کہا یہ قدریہ **محبوس ھذہ الأمة** اور ان سے کلام بھی ترک کر دیا اور ان سے برأت کا اعلان کر دیا انہیں ایام میں مرجہ نے سر اٹھایا تو علما نے کھل کر ان کی مخالفت کی اور ان کے مذہب کی تردید کی گویا اہل کتاب یہود و نصاریٰ نے جب دیکھا کہ اسلام کو طاقت کے زور پر نہ دبایا جاسکتا ہے اور نہ ختم کیا جاسکتا ہے، تو پھر عقائد کو بگاڑنے کے لیے ان خود غرض اور جاہل لوگوں کو مختلف دعوی کے ذریعہ کھڑا کیا جب خلفاء اور امرائے قرنِ اول کے اواخر میں ان کی کثرت اور قرنِ ثانی کے اول میں ان کو خودرو پودوں اور بارشی مینڈھک کی طرح اُگتے اور ٹرٹر کرتے ہوئے دیکھا تو سخت نوٹس لیا اور ایسے ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی ٹھان لی، لہٰذا جب بھی کوئی ایسی جسارت کرتا تو اور اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا چناں چہ جعد ابن درہم نے جب صفات خداوندی کا انکار کر دیا تو خالد ابن عبداللہ قشیری نے اس کو قتل کر دیا پھر جب جہم ابن صفوان نے قدر کا انکار کیا تو سلم ابن احوز نے اس کو قتل کر دیا واصل ابن عطاء نے جب **منزلة بین المنزلتین** کی بات کہہ کر قدر کو آگے بڑھایا اور اعتزال کی بنیاد ڈالی تو حضرت حسن بصری نے اس کو اپنے حلقہ درس سے نکال دیا پھر مقاتل ابن سلیمان نے جب اللہ کے لیے تشبیہ کی بات کہی تو امام ابوحنیفہ نے اس کی مخالفت کی اور فرمایا جانب مشرق سے دو نامعقول و نامشروع رائے کہنے والے لوگ ہم تک پہنچے ایک تو جہم جس نے اللہ کو معطل کہا اور دوسرا مقاتل جو مشبہ نکلا۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے منکر قدر غیلان سے مناظرہ کیا یہاں تک کے اس نے

توبہ کرلی مگر آپ کے انتقال کے بعد پھر گیا تو اس کو ہشام ابن عبدالملک کے پاس لایا گیا، دوبارہ توبہ نہ کرنے پر قتل کردیا گیا، پھر ایک مدت کے بعد خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں اعتزال سر چڑھ کر بولنے لگا یہاں تک کہ ایوان خلافت تک پہنچ گیا اور مہدی اور مامون وغیرہ کے دور میں اسے حکومت کی سرپرستی حاصل ہوگئی، مگر متوکل باللہ نے ان کو کچل کر رکھ دیا اور پھر وہ سر نہ اٹھا سکا۔ اس دور میں خاص مسئلہ خلق قرآن کا تھا، امام احمد ابن حنبل نے اس باطل نظریہ سے جم کر مقابلہ کیا، پھر ابن کلاب اور ابن کرام نے سر اٹھایا، اول الذکر سے امام احمد ابن حنبلؒ نے لوگوں کو دور رہنے کی تاکید کی اور ثانی الذکر کو نیشاپور کے امیر محمد ابن طاہر نے قید میں ڈال دیا۔ اس طرح امت ابتدائی دور ہی سے کذابوں، محرفوں اور فتنہ پروروں سے بچائی جاتی رہی۔ علما نے ایسے لوگوں کو نہ پہلے کبھی برداشت کیا نہ آج برداشت کرتے ہیں اور نہ آئندہ کبھی برداشت کریں گے۔ انشاء اللہ!

الحمدللہ قرن اول میں قرآن اور حدیث دونوں کو مدون کر دیا گیا اور قرن ثانی میں فقہ اور اصول فقہ کو بھی مدون کر دیا گیا قرن ثالث میں علم کلام اور عقائد اصول فقہ اسلامیہ پر کتابیں تصنیف کر دی گئیں؛ اور اس طرح قیامت تک کے لیے امت نے ہر فتنہ سے نمٹنے کا سامان مہیا کرلیا۔ اور پھر ہر زمانہ میں علما اسلام قرآن، حدیث اور کتب عقائد اہل سنت و الجماعۃ مثلاً عقیدہ الطحاویہ وغیرہ کے ذریعہ اہل باطل کا تعاقب کرتے رہے اور اب بھی کر رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے، انشاء اللہ۔

عقائد صحیحہ کی حفاظت میں جو علما پیش پیش رہے وہ یہ ہیں حضرت حسن بصری، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ، امام جریر طبری، امام اوزاعی، امام طحاوی، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام قاسم ابن سلام، عبداللہ ابن محمد جعفی، عبداللہ ابن مسلم ابن قتیبہ، عثمان ابن سعید دارمی، عبداللہ الرحمٰن ابن ابی حاتم، ابوبکر ابن الاثرم، محمد ابن نصر، احمد ابن محمد ابن ہارون ابن خزیمہ، ابوبکر آجری، عبیداللہ ابن محمد ابن بطہ، محمد ابن اسحاق ابن مندہ، ابن ابی الزمنین، امام لکائی، امام غزالی، امام رازی، امام عبدالکاہ ابن طارہ بغدادی، امام شہرستانی، امام ابن حزم، امام ابوالحسن الاشعری، امام محمد ابن محمد ماتریدی، امام اسفرائنی، امام توسی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، علامہ قاسم نانوتوی، علامہ اشرف علی تھانوی، علامہ یوسف لدھیانوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ ظفر احمد عثمانی، مفتی شفیع صاحب، مفتی محمد حسن امرتسریؒ،

علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ مناظر احسن گیلانی، علامہ حسین احمد مدنی، شیخ زکریا، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، علامہ سید سلیمان ندوی، علامہ ابوالحسن علی حسن ندوی رحمہم اللہ تعالیٰ، یہاں پر حصر مقصود نہیں صرف بر سبیل تذکرہ چند علما کے نام تحریر کر دیئے، ورنہ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ احاطہ دشوار ہے، اللہ اہل سنت والجماعت کے تمام حامیوں اور دفاع کرنے والوں کو اپنے شیان شان بدلہ عطا فرمائے اور ہم کو بھی موت تک انہیں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العالمین۔

اسلام ایک ابدی مذہب ہے جسے صلیبی حملہ آوروں نے طاقت کے زور پر ختم کرنے کی کوشش کی جس کا آغاز اسلام کی آمد سے ہی ہو چکا تھا، خلافت عباسیہ کے دور میں اسلام پر تاتاری اور صلیبی طاقت کے ناامید ہونے کے بعد تیمور لنگ کو جو مذہبا شیعہ تھا عثمانیہ کے خلاف بھڑکایا، یزید کو شکست دے کر اسلام کے بڑھتے ہوئے نفوذ کو روکا گیا مگر محمد ابن الفاتح نے قسطنطیہ فتح کیا اور خیر امیر هذه الامة کے مصداق ٹھہرتے۔ اپنی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے خلاف ان اہل کتاب کی پے در پے اتنی شکست ہوگئی تھی کہ اب یہ مایوس ہوگئے اور انہوں نے قتال کے راستے کو چھوڑ کر فکری بربادی کا راستہ اپنایا، علوم عربیہ اسلامیہ کو حاصل کیا اس میں مہارت حاصل کی اور اسلام پر ایسی کتابیں تصنیف کیں جن میں اعتراضات اور شبہات کا ڈھیر لگا دیا۔ مسلمانوں نے انہیں پڑھا اور وہ دین سے دور ہونے لگے۔ پھر انہوں نے آزاد تحقیق کا ڈھونگ رچا کر بچے کھچے مسلمانوں کو اس میں پھنسایا اور یوں مسلمانوں کی بڑی تعداد اسلام سے دور ہوگئی۔ سترھویں صدی کے اواخر میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا، سائنس اور علم جدید کے نام سے انہوں نے کالجز قائم کئے نصاب میں الحاد اور بے دینی کا زہر بھر دیا۔ اور اسی نصاب تعلیم کی تکمیل کے ساتھ معاش کا مسئلہ جوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس پر ٹوٹ پڑے اور انیسویں صدی کے آنے تک مسلمانوں کا بڑا طبقہ دینی علوم کو خیر آباد کہہ کر علم جدید کے پیچھے لگ گیا جس سے ان میں مذہبی بیزاری پیدا ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں نے اسلامی خلافت کے خلاف محاذ آرائی کی جس کے پیچھے یہی سیکولر اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کارفرما تھا جو اہل کتاب یہود ونصاری کے دھوکے کا شکار ہو چکا تھا۔ دشمنانِ اسلام نے اسلام کو کمزور کرنے کے لیے سقوط خلافت کو ضروری تصور کیا اور بیسویں صدی کے آنے تک کمال اتاترک نے سقوط خلافت کا اعلان کر دیا اور یہیں سے مسلمانوں کا تار و پود بکھر

گیا جواب تک ۸۴ر سال کے بعد بھی بکھرا ہوا ہے۔ اگر چہ اب ایک بار پھر احیاء اسلام کی تحریکات دنیا کے ہر علاقہ میں کھڑی ہو رہی ہیں اور الحمد للہ کچھ حد تک کامیاب بھی ہو رہی ہیں مثلاً اخوان المسلمین متحدہ مجلس عمل وغیرہ اور دشمن کو ایک بار پھر یہ خدشہ ہونے لگا ہے کہ کہیں قیام خلافت کا واقعہ پھر رونما نہ ہو جائے: اللهم لاسهل إلا ما جعلته سهلاً وَ أنت تجعل الحزن سهلا إذا شئت لاإله إلا الله الحليم الكريم و الحمد لِلّه رب العرش العظيم۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احیاء اسلام کی اس تحریک کو کیسے کامیاب بنایا جائے اور الحاد جواب کمر توڑ رہا ہے اور واپسی کا سائنس لیریاں اسی کو کیسے کیفر کردار پہنچایا جائے تو بندہ ناکارہ اور گنہ گار کے ذہن میں چند تجاوز اس سلسلے میں گردش کر رہی جو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ مسلمان اس پر توجہ دے کر غور و فکر کریں گے اور مل بیٹھ کر مناسب صحیح ہونے کی صورت میں اختیار کریں گے یا پھر معترف اور فکر مند متدین ذی استعداد نیک سیرت علما کی طرف رجوع کریں اور کوئی صحیح راہ تجویز کریں۔ ان كان فيه صواب فمن الله المومن و المعين أو ان كان خطأ فمن نفسي و الله و رسوله بريء مما اقول۔

امت مسلمہ کے لیے چند تجاویز:

عام حالات کے تناظر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پوری دنیا بے چین اور مضطرب ہے وہ سکون و اطمینان کی تلاش میں ہے اس لیے کہ مادہ پرست فتنے نے انسانی زندگی کو زخموں سے چور چور کر دیا ہے نہ لوگوں میں مذہب کی اہمیت ہے نہ اخلاق کی بل کہ مختصر یہ ہے کہ انسانیت کا دور دور تک کوئی اتا پتا نہیں: إنّهم كالأنعام بَلْ هُمْ أضل۔ یعنی جانوروں سے بھی بدتر حالت ہو چکی ہے ایسے حالات میں ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم انسانیت کا ہاتھ تھامیں اور اسی کو صحیح سمت میں لے جائیں کیوں کہ ہمارا مقصد تخلیق ہی یہ بتایا گیا۔ قرآن کریم نے صاف اور واضح لفظوں میں کہہ دیا: كنتم خير امة اخرجت للناس تأمورن بالمعروف و تنهون عن المنكر ـــــ و لتكن منكم امة يدعون الى الخير يأمرون بالمعروف و ينهون عن المنكر۔ یعنی اسی امت کی تخلیق ہی اس لیے عمل میں

آئی کہ وہ لوگوں کے لیے نفع بخش ہو، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا :خیر الناس من ینفع الناس تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے۔ معلوم ہوا کہ لوگوں کو بھلائی کی دعوت دینا برائی سے روکنا اور ہدایت کی راہ دکھانا ہمارا فریضہ اور ہے، لہٰذا غور کرنا چاہئے کہ عالم انسانیت کو ظلمات سے نور کی طرف کیسے لایا جاسکتا ہے تو سب سے پہلے ہمیں اپنی ہی خبر لینے کی ضرورت ہے کیوں کہ جب تک ہماری اپنی سیرت اسلامی اور ہماری صورت اسلامی صورت نہیں بن جاتی ، ہم دوسرے پر اثر انداز نہیں ہوسکتے آج کا مسلمان اسباب زوال کے پیچھے لگا ہوا ہے میں کہتا ہوں کہ اسباب زوال نہیں سبب زوال یا ام الاسباب للزوال کو جاننے کی ضرورت ہے تو جان لو امت کی تنزلی کا سب سے بڑا اور اہم اگر کوئی سبب ہے تو وہ علما و عملا اسلام سے دوری۔ اسی سبب کو جاننے اور اس کو حل کرنے کی کوشش کرنی ہوگی، اسی کو اقبال نے کہا۔

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہو کر
ہم ذلیل و خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

اکبر نے مسلمانوں کے گزرے ہوئے دور کو یاد کر کے کیا خوب کہا ہے ۔

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا وہ مسلمان نہ رہا وہ مسکن نہ رہا وہ مکیں نہ رہے

عارف باللہ اکبر الہ آبادی نے ایک موقعہ پر مسلمانوں کو حق پر قائم رکھنے اور دشمن سے مرعوب نہ ہونے کی نصیحت کرتے ہوئے کیا خوب کہا ۔

کہو کرے گا حفاظت مری خدا میرا
رہوں جو حق پر مخالف کریں گے کیا میرا
خدا کے در سے اگر میں نہیں بیگانہ
تو ذرّہ ذرۂ عالم ہے آشنا میرا
میر ی حقیقت ہستی مشت خاک نہیں
بجا ہے مجھ سے جو پوچھے کوئی میرا
غرور انہیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر
سوا خدا کے سب ان کا ہے اور خدا میرا

حقیقتاً تو ہونا یہ ہی چاہئے کہ انسان مقصدِ زندگی کو سمجھ کر اسی کے حصول میں تن من دھن کے ساتھ مشغول ہو جائے اور مقصد زندگی کیا ہے جیسا کہ ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا طاہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے۔

تیری بندگی میری زندگی
میری زندگی تیری بندگی

جس کو قرآن نے بیان کیا **وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون** کہ انسانوں اور جناتوں کو محض عبادت و بندگی ہی کی غرض سے پیدا کیا گیا ہے، اگرچہ زندگی میں کچھ ضروریات کچھ لوازمات انسان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اصل مقصد کو چھوڑ کر (یعنی عبادت الٰہی) انہیں خالی ضروریات میں ہمہ تن مصروف ہو جائے بیت الخلا ایک ضرورت ہے استنجاء کرنے کی بقدر ہی انسان اس میں ٹھہرتا ہے پھر وہاں سے نکل آتا ہے وہی پڑاؤ نہیں ڈال دیتا ایسے ہی کھانا پینا رہنا سہنا کمانا فن سیکھنا سیر و تفریح کرنا سونا یہ سب بھی ضرورت ہے، لہٰذا بقدر ضرورت ان میں اپنا قیمتی وقت صرف کرے اور بقیہ وقت آخرت کا تصور مدنظر رکھتے ہوئے اس ابدی اور لافانی زندگی کی تیار میں لگا دے تاکہ **اولئک هم الفائزون** اور **اولئک هم المفلحون** کے زمرے میں داخل ہو جائے اور پروانۂ رضاء الٰہی کو حاصل کر سکے، اللہ تعالیٰ ہمیں آخرت کی تیاری میں مشغول ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ **آمین یارب العالمین !**

اس تمہید کے بعد اب میں بتانا چاہوں گا کہ اصل میں تو یہ ہے کہ مسلمان کا نظر اور عمل یہ ہونا چاہئے کہ وہ دینی علم حاصل کرے، زیادہ نہیں تو بقدر ضرورت تو ضرور حاصل کرے اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے کے مطابق وہ فرض ہے: **طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة** یعنی ضروری علم دین کی تعلیم ہر مسلمان مرد عورت پر فرض ہے اب ضروری علیم دین کیا ہے تو سب سے پہلے بینادی عقائد کا جاننا یعنی اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اس کے مانند کوئی نہیں کوئی چیز اس کو عاجز نہیں کرسکتی، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ ذات قدیم ہے، اس کی کوئی ابتدا نہیں، وہ ہمیشہ رہنے والا ہے اس پر کوئی فنا نہیں، اور اسی کی مشیت سے سب کچھ ہوتا ہے، مخلوق میں سے کوئی اس کے مشابہ نہیں، زندہ ہے اس پر موت نہیں آئے گی، نظام عالم کو تھامے ہوئے ہے، غافل نہیں، نہ اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ،

وہی پیدا کرنے والا بغیر کسی حاجت کے وغیرہ وغیرہ ہمارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وہ آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی نبی نہیں، ملائکہ اللہ کی پاکیزہ مخلوق ہیں، جنت وجہنم برحق ہیں موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے، تمام آسمانی کتابیں برحق ہیں، تمام انبیاء برحق ہیں، تقدیر چاہے اچھی ہو یا بری منجانب اللہ ہے، برزخ برحق ہے، مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیئے جائیں گے، دنیا میں کیئے ہوئے اعمال کا حساب وکتاب دینا ہوگا، میزان عدل قائم کی جائے گی اور جزا وسزا کا فیصلہ ہوگا وغیرہ وغیرہ، یہ تو ہوئے کچھ ضروری عقائد مسلمان پر دوسرا اہم فریضہ نماز ہے، لہٰذا مسائل نماز کا جاننا ضروری ہے، اگر مالدار ہے تو مسائل زکوٰۃ کا جاننا اگر حج فرض ہو جائے تو مسائل حج کا جاننا ضروری، مسائل صوم کا جاننا ضروری، اگر تاجر ہے تو مسائل تجارت کا جاننا ضروری، اگر اجیر ہے تو مسائل اجارہ کا جاننا ضروری، اگر نائی ہے تو حجامت کے مسائل جاننا ضروری، غرضیکہ عقائد نماز روزہ اور جس پیشہ سے مسلمان کا تعلق ہو اس کے مسائل کا جاننا ضروری ہے، تاکہ حلال وحرام کے درمیان تمیز کرسکے زیادہ بہتر تو یہی ہے کہ علم دین حتی المقدور خوب اچھی طرح معتبر علما سے معتبر کتابوں سے حاصل کرے؛ اب یہ ضروری علم کے حصول کا امکان کس طرح ہو؟

(۱) اولاً تو گھر کا ماحول دینی بنایا جائے گھر کا ہر فرد فرائض و واجبات کا مکمل اہتمام کرے تاکہ بچوں پر بھی اس کا اثر ہو، کیوں کہ ماحول ہی انسان کو نیک اور بد بنانے میں بڑا کردار ادا کرتا ہے مغرب کی اندھی اور گمراہ کن تقلید کو ترک کردیا جائے، فیشن زدہ زندگی سے توبہ کی جائے، اور سادہ اسلامی زندگی اپنائی جاوے، ٹی وی، وی سی آر، ویڈیو سی ڈی پلیر وغیرہ کو گھر میں نہ بسایا جائے انشاء اللہ گھر کا ہر فرد صحیح فکر اور صحیح عقائد کا حامل ہوجائے گا۔

(۲) دوسرا نمبر جب بچہ بولنے لگے تب ہی سے **اللہ و رسول، بسم اللہ، الحمد للہ، ماشاء اللہ، انشاء اللہ، السلام علیکم، جزاکم اللہ،** اور ہر موقعہ کی ادعیہ ماثورہ کی اس کو تعلیم دی جائے، اور Good Morning وغیرہ کی تعلیم سے اجتناب کیا جائے تاکہ اسلامی تعلیمات کا وہ بچپن ہی سے عادی بن جائے بعد میں اس کو اجنبیت محسوس نہ ہو۔

(۳) جب بچہ تین چار سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کے لیے دینی تعلیم کا نظم کیا جائے اگر قریب میں مکتب ہو تو اس میں پورے اہتمام کے ساتھ بھیجا جائے ورنہ گھر پر ہی کسی عالم دین کے ذریعہ دینی تعلیم کا نظم کیا جائے جس سے اس کو احسن القواعد، نورانی قاعدہ، اردو کا آسان

قاعدہ، دینی تعلیم از مفتی کفایت اللہ صاحب یا اسلامی تعلیم یا تعلیمات اسلامیہ از مولانا مسیح اللہ خان صاحب، بہشتی ثمر از حضرت تھانوی، تقویۃ الایمان از شاہ اسماعیل شہید، اسلام کیا ہے؟ از مولانا منظور نعمانی، عقائد الاسلام از مولانا عبدالحق حقانی یا عقائد اسلام از مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی، دین وشریعت از مولانا منظور نعمانی جیسی اہم اور بنیادی کتابیں سبقا سبقا پڑھا دی جائیں، تاکہ اس کا مزاج دینی بن جائے۔ ناظرہ مکمل صحت و تجوید کے ساتھ پڑھا دیا جائے اور بچہ کی خوب نگرانی کی جاوے کہ کہیں وہ کسی غلط صحبت میں نہ پڑ جائے، اور بری عادتیں اس میں نہ سما جائیں، فلم بینی گٹکھا خوری میں مبتلا نہ ہو جائے۔

(۴) جب وہ کچھ بڑا ہو جائے تو کسی بزرگ کی خدمت میں گاہے گاہے لے کر حاضری دیا کریں تاکہ ان کی صحبت اور دعاؤں سے شرور وفتن سے محفوظ رہے اور ان کی توجہات سے دین پر ثابت قدم رہے کوئی سوال ذہن میں گردش کرے تو پوچھ لیا کرے، اور اس حاضری کا اہتمام کرے ایسے ہی بزرگ کی خدمت حاضری دے جو مکمل دین کے پابند ہوں بدعات و خرافات کی تائید یا پیروی نہ کرے، ورنہ آپ بھی حسن نیت کے باوجود گمراہ ہو جائیں گے۔

(۵) گھر میں کسی دینی کتاب کی تعلیم کا اہتمام کیا جاوے مثلاً فضائل اعمال از شیخ زکریاؒ، سیرت خاتم الانبیاء از مفتی شفیع، سیرت مصطفیٰ از علامہ ادریس کاندھلوی، اسوۂ رسول اکرم از ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفیؒ، سیر الصحابہ، اصلاحی خطبات از علامہ تقی عثمانی، معارف الحدیث از مولانا منظور نعمانی، معارف القرآن از مفتی شفیع صاحب، تفسیر عثمانی از علامہ شبیر احمد عثمانی، تاریخ اسلام از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، معمولات نبوی از مولانا سراج الحق مچھلی شہریؒ تاکہ ایمان و یقین میں تازگی پیدا ہوتی رہے، اور الحاد و بے دینی سے پورا گھر محفوظ رہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ انشاء اللہ ان پانچ امور کے اہتمام سے پورا معاشرہ اصلاح اور صراط مستقیم پر آسکتا ہے، اور دینی بیزاری کے سیلاب کو روکا جاسکتا ہے اور قیادت وسیادت عالم ایک بار پھر مسلمانوں کے ہاتھوں میں آسکتی ہے۔ اور ساری انسانیت چین وسکون کا سانس لے سکتی ہے، کیوں کہ دور حاضر کی سب سے بڑی مصیبت ہی بے دینی اور فسق وفجور ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے عصری تعلیم کے حصول کا کیا حکم ہے؟ تو اولاً تو یہ جان لینا چاہئے کہ ہمارا دین مقدم پھر سب کچھ کیوں کہ دین ہوگا تو سب کچھ ملے گا دین نہ ہوگا، تو کچھ ہاتھ آنے والا نہیں ترکی، ۱۹۲۳ء سے سیکولرزم کی راہ پر چلا، اور دین کو زندگی سے بے دخل کر

دیا۔اور یہ کیوں؟ تا کہ ترقی حاصل ہو جائے (العیاذ باللہ) اتاترک کی نظر میں دین ہی اصل رکاوٹ ہے۔ ذرا سوچیے، ۸۴ رسال ہو چکے کیا ترکی ترقی کر سکا؟ جواب ہوگا نہیں۔ اس لیے دین اسلام سے بغاوت کبھی ترقی کی راہ پر نہیں لا سکتی اور یہی حال دنیا کے دوسرے اسلامی ممالک کا ہے مگر اب بھی سمجھ میں آتا نہیں۔ **اللھم وفق ولاۃ امور المسلمین بالقول و الفعل والعمل لما تحب و ترضی انت یاربنا۔**

مسلمانوں کے مغربی عصری علوم کی طرف میلان کی تاریخ کا آغاز، ۱۶۹۹ء سے ہوتا ہے یعنی آج سے تقریباً تین سو آٹھ سال پہلے اور یہ میلان دشمنانِ اسلام کی ایک سازش کی تحت تھا تا کہ علوم عصریہ میں مشغول کر کے ان کو دین سے غافل کر دیا جائے اور جب دین سے یہ غافل ہو جائیں گے تو ان پر حکومت کرنا آسان ہو جائے گا، اور ہوا بھی ایسا ہی کہ تھوڑے ہی پیمانہ پر انہیں کامیابی ضرور ملی لیکن اس وقت کے علمانے بہت کوشش کی جس کے نتیجے میں الحمد للہ انہیں مکمل کامیابی نہ مل سکی، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی دین الحمد للہ اپنی تمام صحیح تعلیمات کے ساتھ ایک طبقہ میں موجود ہے مگر جب عصری تعلیم کے حصول کے رجحان سے مسلمانوں کو مکمل طور پر نہ روکا جاسکا تو علمانے اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کو تلقین کی کہ تم شوق سے عصری تعلیم حاصل کرو مگر اسلامی ضروری تعلیم کے ساتھ جس کے لیے باقاعدہ طور پر مکاتب اسلامیہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس کی وجہ سے الحمد للہ امت کو بہت نفع ہوا اور مسلمانوں کی بڑی تعداد کفر و شرک، الحاد و زندقہ سے محفوظ ہوتی چلی آرہی ہے، مسلمان والدین اور فکر مند لوگوں کو اسی نظام کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

مگر جب فکر مند علمانے دیکھا کہ امت کا بڑا طبقہ مکاتب اسلامیہ سے بھی غفلت برت رہا ہے، جس کی وجہ سے دین کی بالکل بنیادی باتوں سے ناواقف ہوتا چلا جارہا ہے، اور دوسری طرف دشمنانِ اسلام نے نصاب ایسا مرتب کیا ہے کہ دین سے کورا مسلمان اس کے جال میں پھنس کر دین سے بیزاری کا اعلان کر دیتا ہے اور اسکولوں کا ماحول بھی ایسا کہ وہ غیر شعوری طور پر اسلام ہی سے خارج ہو جاتا ہے، تو علمانے نصاب بدلنے کی کوشش شروع کر دی اور حکومت کی سطح پر جبریہ تعلیم کی مخالفت کی، جس میں کامیابی نہ مل سکی، تو اب ان کے سامنے یہی راستہ بچ گیا کہ جب ڈگریاں حاصل کرنے کا بھوت سوار ہو چکا ہے اور سیلاب تھامے نہیں تھمتا تو "عصری تعلیم دینی ماحول" میں حاصل کرنے کی راہ اپنائی جائے اور انہیں

بتایا جائے کہ اس سیلات میں کونسا زہریلا مادہ ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔ نصاب ہی طرح بل کہ اس سے کچھ زائد مہلک مرض ماحول سے پیدا ہوتا ہے کم از کم بے دینی کے ماحول سے مسلمانوں کو بچالیا جائے، تو اس سے توقع ہے کہ نصاب تعلیم سے پیدا ہونے والے زہریلے اثر کی طرف بھی نشاندہی ہو سکے گی اور اس کے متعدی فساد کو روکا جاسکے گا۔ تعلیمی ماحول کس قدر مؤثر رول ادا کرتا ہے اس کے متعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

"بڑا سبب وہ کالجوں کا لادینی ماحول ہے جس میں ہماری نئی نسل پلتی اور ڈھلتی ہے، جس کی وجہ سے قلوب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ عظمت ومحبت باقی نہیں رہتی، جو ایمان کے لیے ضروری ہے"۔ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

"مسلمان تعلیمی ادارے خود قائم کریں اور بچوں کو ابتدا ہی سے دینی ماحول فراہم کیا جائے، یہ مسلمانوں کی موت اور زندگی کا مسئلہ ہے"۔

اسی طرح سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نظام تعلیم وتربیت میں ارشاد فرمایا:

"مسلمانوں کے اپنے ذاتی کالجز اور ہاسٹل ہونے چاہئیں"۔ (پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم تربیت)

عارف باللہ قاری صدیق احمد باندوی رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ اجل الشیخ اسعد اللہ صاحبؒ کا بھی رجحان یہ تھا کہ مسلمانوں کے اپنے کالجز اور ادارے ہونے چاہئیں، تاکہ نسل کو الحاد سے بچایا جائے جس میں ماحول پورا اسلامی ہو۔

یہ تھی اکابرین امت کی رائے اس سے پہلے بھی بتایا جاچکا کہ مسلمان کے لیے دین بہت اہم بلکہ سب سے اہم ہے سب کچھ برداشت ہوسکتا ہے، مگر دین میں نقص برداشت نہیں ہوسکتا، مسلمانوں کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کرنا چاہئے، اور اپنے بچوں کو عیسائی مشنری یا کسی دوسرے غیر مسلم اداروں میں تعلیم دینے کے بجائے اسلامی ماحول والے اداروں ہی میں تعلیم کا نظم کرنا چاہیے۔ ورنہ مسلمان کے لیے ڈگریاں اور عہدے سب کچھ دین کے ضائع کرنے کے ساتھ بے سود اور بیکار ہے کیوں کہ آخرت کا خسارہ یہ بڑھا ہوا ہے دنیا کے مقابلہ میں۔ دنیا نہ کماسکے اور مرگئے تو کوئی حرج نہیں مگر دنیا مل جائے اور دین جاتا

رہے، یہ کہاں کی عقلمندی ہے؟ یہ تو کوئی ایسا ہی ہوگا جیسے قرآن نے کہا ہے: ''أولـــئک الـذین اشتروا الحیاۃ الدنیا بالآخرۃ''۔ یعنی ان لوگوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں خرید لیا۔ یہ مسلمانوں کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔ جان چلی چلا جائے مال جائے، مگر دین کسی صورت میں نہیں جانا چاہئے۔

اب ذمہ داری آتی ہے ان مسلمان رہنماؤں پر جو اس طرح دینی ماحول میں دنیا کی تعلیم کا نظم قائم کریں تو کن چیزوں کا خیال کریں اور خود کیسے ہوں۔

(۱) اولا تو ذمہ داروں کا طور وطریق رہن سہن بول چال نشست و برخواست لباس وغیرہ سب کچھ مکمل اسلامی ہو اور دین کا کافی وشافی علم ان کے پاس ہو ساتھ ہی ساتھ دینی حمیت وغیرت ان کی طبیعتوں کا لازمہ ہو تا کہ وہ نوجوانوں کی صحیح تربیت کی فکر کریں اور کالجز کے ماحول کو غیر اسلامی امور سے محفوظ رکھیں اور مداہنت فی الدین کا مظاہرہ نہ کریں۔

(۲) طلبہ کے لیے دینی تعلیم کے حصول کا انتظام کریں تا کہ وہ دین کا ضروری علم جو حاصل کرنا تھا نہیں کر سکے اب اسے حاصل کرلیں اور قرآن کی تلاوت سیکھ لیں۔

(۳) ہاسٹل میں نمازوں کا انتظام کریں اور اس کی پوری نگرانی رکھیں تا کہ طلبا کسی غیر اسلامی، بددینی کے شغل میں نہ پھنسنے پائیں۔

(۴) کالجز میں ہفتہ میں ایک یا دو ایسے لیکچر کا انتظام کریں جس میں نصاب میں سموئے ہوئے زہر سے طلبہ کو متنبہ کیا جائے مثلاً بتایا جاوے کہ نظریۂ ارتقاء اور ڈاونیت کوئی چیز نہیں یہ باطل اور گمراہ کن عقیدہ ہے دین کی زندگی میں کیا اہمیت ہے عقل نقل اور سائنٹیفک انداز میں یہ چیزیں طلبہ کے سامنے بیان کیا جائے۔

(۵) طلبہ پر محنت کی جائے کہ وہ تبلیغی جماعت میں حصہ لیں تا کہ ضروریات دین کے ساتھ سنن وغیرہ کا علم اور اس پر عمل کرنے کا موقع میسر آوے۔

(۶) وقفہ وقفہ سے بزرگان دین کو بلا کر ان کے درمیان بیانات کا انتظام کریں تا کہ یہ دینی بیانات ان کے اندر دین کی چاشنی اور لذت پیدا کرے۔

(۷) اولاً حکومت سے مطالبہ کرے کہ وہ مخلوط تعلیم کے بجائے الگ الگ تعلیم کی اجازت دے اور اگر حکومت نہ منظور کرے تو پردہ کا اہتمام کیا جائے اور لڑکیوں پر دین کی محنت کی جائے۔

نوٹ: مسلمان والدین کو یہ بات جان لینی چاہئے کہ بچیوں کو عصری تعلیم زیادہ دینے کی ضرورت نہیں، لکھ پڑھ لے کافی ہے۔ ہاں! دینی تعلیم کا علم ضرور دینا چاہئے، اور اس کے لیے ''مومنہ کورس'' کا آغاز کرنا چاہئے، جس میں عقائد اور عورتوں کے ضروری مسائل اور طریقہ تربیت اولاد پڑھا دیا جائے اور بس جو اسلامی ادارے کالجوں میں داخلہ دے رہے ہیں ان کے سامنے جو بھی مجبوری ہو لیکن انہیں یہ سوچ لینا چاہئے کہ اپنے جگر گوشوں کے دین و اخلاق کی حفاظت کا انہوں نے کیا بندوبست کیا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ موجودہ و آئندہ نسل کے ایمان و عمل اور ان کے اخلاق و تہذیب کی حفاظت کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے کہ جس کے بارے میں کل اللہ کے سامنے جوابدہ ہوں گے، ورنہ کل قیامت کے دن اللہ کو کیا جواب دیں گے، ہم نے اس رسالہ میں دینی تعلیم کی ضرورت عصری تعلیم کے حصول کے لیے حدود و قیود اسلام اور سائنس اور عصری تعلیم کے خوفناک نتائج کو جمع کیا اور چند تجاویز قارئین کے سامنے پیش کی ہیں۔ گذشتہ صدی میں چوں کہ سائنس اور فلسفہ نے مسلمانوں کے عقائد و افکار کو بہت متاثر کیا اور سائنس سے مرعوبیت کے پیش نظر بعض مسلمانوں نے سائنس دانوں کے بعض نظریات کو جو ثابت شدہ بھی نہیں تھے بل کہ تحقیق سے غلط ثابت ہو چکے تھے اور اسلامی عقائد سے بھی مزاحم تھے، قبول کر لیا، بعض مسلمان شبہات میں پڑ گئے اور بعض معذرت خواہانہ تاویلیں شروع کر دیں، ان چیزوں کے جوابات اپنے وقت کے محقق علما اور اہلِ فن نے مدلل طریقے سے دیئے ہیں، زیرِ نظر رسالہ میں ان میں سے کچھ مباحث زیرِ بحث آئیں ہیں، جن میں مادے کا قدیم ہونا جس سے خدا کی قدرتِ کاملہ، معجزاتِ انبیا پر زد پڑتی ہے کو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور بعض سائنس دانوں اور مولانا عبد الباری ندوی کے حوالے سے رد کیا ہے، اس کے علاوہ مادہ اور روح، سائنس اور اسلام کے مابین باہمی نسبت، مسلمان سائنس داں اور غیر مسلم سائنس داں کے طرزِ فکر، طرزِ عمل اور تعین مقاصد میں فرق۔ ان سب چیزوں کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبد الباری ندویؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی تحقیقات و تعلیمات کی روشنی میں نیز ڈاکٹر ہارون یحییٰ صاحب کے حوالے سے سائنس دانوں کے تجربات، اعتبارات کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں۔ چوں کہ یہ سب مسائل سیکولر لادینی تعلیم اور سیکولر ذہن کے پیدا کئے ہوئے ہیں لہٰذا سیکولرزم کی حقیقت

واضح کی گئی ہے اور سیکولر تعلیم کے باب مسلمانوں کے سامنے جو لمحۂ فکریہ آپڑا ہے، اس کے متعلق مسلمانوں کو کیا لائحۂ عمل کرنا چاہیے، یہ موضوع بھی زیرِ بحث آیا ہے۔ اس میں چند مضامین بطور خاص عصری تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے ضروری ہیں کیوں کہ نصاب تعلیم کی وجہ سے جو گندگی ذہن میں بیٹھ گئی ہے وہ صاف ہو جائے، لہٰذا مسلمان اسکول کے ذمہ دار بطورِ خاص اِن مضامین کو عام کریں۔ یہ مضامین حکیم فخر الاسلام صاحب نے ترتیب دیئے ہیں۔ مذکورہ موضوعات پر حکیم فخر الاسلام نے جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا کے زیرِ انتظام چلنے والے عصری تعلیم کی درسگاہوں میں سال گذشتہ سے اب تک لیکچر دیئے تھے، جن سے طلبہ کو خاطر خواہ نفع ہوا، اور عام طور پر بھی ان موضوعات کی افادیت محسوس کی گئی۔ آپ مظاہر سے فارغ التحصیل بھی اور علیگڈھ سے طب یونانی کے سند یافتہ بھی ہیں، ان مضامین کی اشاعت و ترویج کی عام اجازت ہے، مگر کسی طرح کی دبیشی کے بغیر بالکل ہو بہو ہو۔

دیکھا جائے تو الحمد للہ پورا شمارہ ہی اس قابل ہے کہ جدید ذہنیت کی فکری قوت کو دستک دے اور فکر وخیال کے لیے صحیح شاہ راہ ہموار کرے۔ لیکن اس کی ضرورت اور افادیت کا صحیح اندازہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

اخیر میں ایک خوشخبری کے ساتھ اپنے مضمون کو سمیٹ رہے ہیں، کہ انشاء اللہ ہم بہت جلد ''دراسات دینیہ'' کا آغاز کرنے جا رہے ہیں جس میں عصری تعلیم یافتہ طلبہ کے لیے دینی تعلیمی کورس کا انتظام ہوگا، جو ایک یا دو یا تین سال پر مشتمل ہوگا تا کہ امت کے اس طبقہ کو بھی دین سے آگاہ کر دیا جائے دعا کریں اللہ قبول فرمائے۔

اور ادارہ اخیر میں یہ بھی اعلان کر رہا ہے کہ آئندہ شمارہ ''فقہ المناسبات'' پر ہوگا، جس میں خاص طور پر اسلامی مہینوں کے مسنون اعمال اور منکرات اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی ماہ میں منائے جانے والے ڈیز (Days) مثلاً ویلن ٹائن ڈے، اپریل فل وغیرہ کا پس منظر، طریقہ کار اور شرعی حکم بیان کیا جائے گا، اور اخیر میں مختلف تقریبات مثلاً ولیمہ، عقیقہ، میت، نکاح، وغیرہ کا شرعی طریقہ کار ہوگا۔ دعا فرمائیں اللہ کام کو آسان فرمادے، اور اسباب مہیا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

ابوحمزہ وستانوی

<u>ربیع الاول کی مناسبت سے:</u>

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہر طبقہ بشری کے لیے بہترین نمونہ

ابوحمزہ وستانوی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ مسلمان ہی نہیں ساری انسانیت کے ہر طبقہ کے لیے بہترین نمونہ ہے اسی لیے قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ ''لکم'' اور ''اسوۃ'' دونوں میں عموم ہے یعنی تم سب کے لیے چاہے تمہارا تعلق انسانیت کے کسی بھی طبقہ سے کیوں نہ ہو، چاہے امیر ہو یا غریب، معلم ہو یا متعلم، نوجوان ہو یا بوڑھا، بچہ ہو یا ادھیڑ عمر، شوہر ہو یا باپ، فاتح ہو یا مفتوح، غالب یا مغلوب، بادشاہ ہو یا رعایہ، امام ہو یا مقتدی، واعظ ہو یا یتیم۔ بہر حال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہر ایک کے لیے ایسا نمونہ ہے کہ جس پر چل کر اللہ کی خوشنودی حاصل ہو سکتی اور انسان دارین کی کامیابیوں سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ جب تک امت نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آئیڈیل بنائے رکھا، امت کامیابی وکامرانی کی عزت ووجاہت کی منزل کو طے کرتی گئی اور جہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اعراض کیا پستی اور تنزلی کی طرف آنے لگی۔ اگر کوئی کہے کہ مسلمان تعلیم اور ٹیکنالوجی نہ حاصل کرنے کی وجہ سے یا مال ودلت کی کمی کی وجہ سے قیادت وسیادت سے ہاتھ کھو بیٹھا تو یہ اس کی حماقت اور بے وقوفی ہے، اس لیے کہ جن مسلم ممالک نے تعلیم وٹیکنالوجی حاصل کی وہ بھی آج تک ترقی کو نہیں پہونچ سکے، کیا آپ نے ترکی اور ایران، ملیشیا، ترکستان، پاکستان، لیبیا، شام کو نہیں دیکھا کیا انہوں نے ٹیکنالوجی حاصل کر کر دنیا میں اپنا مقام نہیں بنایا، کیا روشن خیالی اور مغربیت کے نعرے نے

ترکی کو کسی بھی میدان میں عزت سے ہم کنار کیا؟ اللہ امت کی کمال اتاترک جیسے لوگوں سے حفاظت فرمائے اور کسی بھی اسلامی ملک کو گمراہ رہبروں سے دوچار نہ کرے جو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کھلے عام بغاوت کا اعلان کرے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمادیا: ”**لا یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اوله او کما قال صلی الله علیه وسلم**“ یعنی اس امت کے آخری دور کے افراد کی فلاح وصلاح اسی چیز سے ہو سکتی ہے، جس سے پہلے لوگوں کی ہوئی اور آپ جانتے ہیں کہ صحابہ اور ہمارے اسلاف کو کامیابی سنت نبوی پر چل کر ہی ملی کیا ان صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے پاس کوئی ٹیکنالوجی تھی؟ نہیں نہیں! وہ بیچارے اس زمانے کے صحیح ہتھیاروں سے بھی عاری تھے، مگر سنت پر چل کر ان کی دوسو کی جماعت بھی ہزار کو، دس ہزار کی جماعت اس زمانہ کی سُپر پاور قیصر وکسریٰ کی مسلح فوجوں کو بھی شکست وہزیمت سے دوچار کر دیتی تھی۔ ذرا ہمارے صحابہ اور اسلاف کی تاریخ کی ورق گردانی کر کے دیکھو تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی کامیابی کا راز سنت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ اور اسوۂ نبوی علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام کے علاوہ کوئی چیز نہیں؟ لہٰذا ہم یہاں پر صرف ہر طبقہ کے افراد کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مراحل کی نشاندہی کرنا چاہیں گے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کون حصہ کس طبقہ بشری کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ تو آئیے میرے پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو مرحلہ وار معلوم کر کے آج ہی اس پر عمل پیراں ہونے کا پختہ عظم کریں۔ اللہ رب العزت ہم مسلمانوں کو تمام گمراہ لوگوں کی پیروی سے نکال کر نبی آخرالزماں علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام کی اتباع کرنے کی حتی الامکان توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

میرے نبی کی زندگی کا نقشہ:

(۱) اے مسلمان! اگر صاحب ثروت اور مالدار ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ جس میں آپ نے بعثت سے پہلے حجاز اور شام کے درمیان تجارت کی اور اسی طرح ان ایام کا بھی مطالعہ کر جس میں آپ بحرین کے خزانہ کے مالک بن گئے۔ اسی لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت میں نہ کسی کو دھوکہ دیا، نہ کسی سے جھوٹ کلام کیا اور حرام کمائی کے قریب بھی گئے اور نہ کبھی وعدہ شکنی کی اور نہ کبھی شریک کے ساتھ خیانت کی گویا حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہر مسلمان تاجر اور مالدار کے لیے قابل تقلید ہے۔

(۲) اور اگر اے مسلمان! تو تہی دست وتہی دامن ہے تو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ان ایام کا مطالعہ کر جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شعب ابی طالب میں محصور کر دیئے گیے تھے اور ان ایام کا بھی مطالعہ کریں جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آ کر گذارے۔ ایسے سخت حالات آئے کہ کبھی فاقہ کی نوبت تک آجاتی مگر پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے سامنے ہاتھ دراز نہ فرماتے تھے بل کہ صبر وتحمل سے کام لیے تھے، لہٰذا غریبوں کے لیے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قابل تقلید ہے۔

(۳) اور اگر اے مسلمان! تو بادشاہ ہے نبی کریم صلی اللہ کی زندگی کے ان ایام کا مطالعہ کر جس میں آپ پورے جزیرۃ العرب پر قابض ہو گئے مگر آپ نے کبھی بھی کسی پر ظلم نہیں کیا، نہ کسی سے مال ظلما لیا اور نہ کسی کو ظلما قتل کیا، بل کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے شمار اپنے جانی دشمنوں کو معاف کر دیا، صرف معاف ہی نہیں کیا ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا۔

(۴) اور اے مسلمان! اگر تو کسی ملک میں رعایہ کی حیثیت سے آباد ہے تو مطالعہ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایام کا جس کو آپ نے مکہ میں گذارے نہ کبھی چوری ڈکیتی کی، نہ کسی کو ستایا، بل کہ ظالموں کے ظلم پر صبر کرتے رہے اور یتیموں مسکینوں اور ضعیفوں کی نصرت کرتے رہے۔ اسی لیے تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا تھا: وَ اللّٰہُ لَا یُخْزِیْکَ اللہُ اَبَدًا ۔ اللہ آپ کو کبھی بھی رسوا نہ کرے گا۔ کیوں کہ آپ مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں، یتیم وغریبوں کی مدد کرتے ہیں، بل کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعثت سے پہلے بھی لوگ الصادق الامین کہتے تھے معلوم ہو رعایہ کے لیے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم قابل تقلید ہیں۔

(۵) اور مسلمان اگر کو فاتح ہے تو مطالعہ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ایام کا جب آپ نے مکہ کو فتح کیا اور جانی دوشمنوں کے بارے میں بھی اعلان کر دیا: لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ ۔ اے اہل مکہ! آج تم پہ کوئی زیادتی نہ ہوگی۔ معلوم ہوا فاتح کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ ہے، نہ کہ امریکہ اور روس، نہ برطانیہ۔

(۶) اور اے مسلمان! اگر تو شکست خوردہ (اللہ تیرے لیے کبھی بھی شکست مقدر نہ کرے)، تب بھی مطالعہ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ان ایام کا جب آپ صلی

اللہ علیہ وسلم اُحد میں ابتداءً شکست سے دوچار ہوئے مگر کوئی آہ واویلہ نہ کیا۔

(۷) اے مسلمان! اگر تو معلم اور استاد ہے تب بھی حضور کی زندگی ان ایام کا مطالعہ کر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں بیت ارقم ابن ارقم میں اور مدینہ آنے کے بعد مسجد نبوی اور صفہ میں صحابہ کو دین سکھاتے تھے، کتنا عمدہ اُسلوب تھا نبی کی تعلیم دینے کا کہ ایک بات کو تین مرتبہ دہراتے تھے تاکہ ہر ایک سمجھ میں آجائے سوال کرنے والے کے سوال کا مقتضیٰ حال کے مطابق جواب دیتے تھے۔ نہ خفا ہوتے تھے اور نہ ناراض ہوتے تھے۔

(۹) اور اے مسلمان! اگر تو طالب علم ہے تو مطالعہ کر ان ایام کا جب کے وحی لے کر جبرئیل علیہ السلام آپ کے پاس آتے تو آپ پوری توجہ اور رغبت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہو جاتے نہ کبھی ان کی گستاخی کرتے اور نہ ان کے سامنے بے ادبی سے کام لیتے بل کہ تواضع اور انکساری کے ساتھ کام لیتے تھے۔

(۱۰) اور اے مسلمان! اگر تو واعظ ہے تو مطالعہ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کے ایام کا جب مدینہ میں صحابہ کو کبھی درخت کے پاس کھڑے ہو کر، کبھی مسجد کے منبر پر بیٹھ کر فصیح و بلیغ الفاظ میں وعظ دیتے نہ بہت طویل وعظ دیتے اور نہ بہت قصیر، بل کہ درمیانہ روی اختیار کرتے اور احوال کو دیکھ کر وعظ دیتے، یہاں تک کہ مجلس ایسی متاثر ہوتی کہ رونے لگتی۔

(۱۱) اور اگر اے مسلمان! تو یتیم ہے تو مطالعہ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین بچپن میں رحلت فرما چکے تھے۔ پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ سلم نے کتنا عمدہ بسر کیا۔

(۱۲) اور اگر تو صغیر السن ہے، تو مطالعہ کر ان ایام زندگی کا جن کو آپ نے حلیمہ سعدیہ کے گھر پر گزارے کہ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ چراگاہ جاتے تھے اور کبھی آوارہ اور اوباش لڑکوں کے ساتھ وقت نہیں گزارتے تھے۔

(۱۳) اگر تو نوجوان ہے، تو مطالعہ کر آپ ان ایام شباب کا جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کی بکریاں چرا کر گذارے، نہ کبھی کسی گانے کی محفل میں گئے اور نہ کبھی کسی بری حرکت کا ارتکاب کیا، بل کہ شریف اور صادق وامین کے لقب سے مشہور ہوئے، مسلمان نوجوان ان فلم اسٹاروں اور کھلاڑیوں کے نقش قدم پر آخر کیوں چلتا ہے؟ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر بھی کوئی قابل تقلید آئیڈیل ہو سکتا ہے؟

(۱۴) اور اگر تو جج یا حاکم ہے تو مطالعہ کر حضور کی زندگی کے واقعہ حجر اسود اور واقعہ مفتاح کعبۃ اللہ وغیرہ کا۔

(۱۵) اور اگر تو شوہر ہے، تو مطالعہ کر خدیجہؓ اور عائشہؓ اور دیگر اُمہات المومنینؓ کے ساتھ گزرے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوقات کا اور لمحات کا۔

(۱۶) اور اگر تو دادا۔ یا۔ نانا ہے، تو حسن و حسین کے نانا کے ان لمحات کا مطالعہ کر جو حسن و حسین کے ساتھ گزارے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تو جس کسی بھی حالت میں یا درجہ پر ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تجھے اس حالت اور مرتبہ کو گزارنے کا صحیح سلیقہ اور منہاج بتلائے گی ربیع الاول کی مہینے کی مناسبت سے آپ ضرور یہ عہد کریں کے ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو ضرور ایک بار پڑھنگے اور پھر اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے انشاء اللہ۔ دنیا اور آخرت کی کامیابی وکامرانی آپ کے قدم چومیں گی اور اطمینان سکون جیسی عظیم نعمت آپ کو دو تو جہاں بھی ان خطوط پر چل کر آسانی کے ساتھ مل جائے گی، جس کے لیے آج دنیا کوشاں ہی اللہ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆☆

مدارس اسلامیہ علامہ اقبال کی نظر میں

ان مکتبوں اور مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو ان ہی مدرسوں میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ اب جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمرا اور باب الاخوتین کے نشانات کے سواء اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے اثر کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سواء مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔ (علامہ اقبالؔ)

نصاب تعلیم کی اہمیت

فخر الاسلام الہ آبادی
استاذ احمد غریب یونانی میڈیکل کالج اکل کوا

اسکولوں، کالجوں میں ہندوستانی تاریخ کی کتابوں کا اصلی خاکہ یورپی مصنفین کا تیار کیا ہوا ہے، جس میں تعصب بھر دیا گیا ہے ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ (ہندو اور مسلمان) بچپن ہی سے اس زہر کو پی پی کر ایک دوسرے کے بارے میں شکوک شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ہمارے اسکولوں، کالجوں میں ہندوستانی تاریخ کی کتابیں ایک زمانہ سے پڑھائی جارہی ہیں۔ ان کا اصل خاکہ یورپی مصنفوں کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ ہم ابھی تک فرقہ واریت اور جانبداری کے اس بوجھ کو اتار پھینکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جو یورپی اسکالروں نے ہمارے دماغوں میں بھر دیا ہے۔ تاریخ کہی جانے والی ان کتابوں نے قارئین کے ذہنوں کو بری طرح متاثر کیا اور قومی زندگی کے ذرائع کو منتشر کر دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہندو تہذیب اور رسم ورواج کو تباہ کرنے اور ہندو مندروں اور محلوں کو منہدم کرنے والے ایسے بد دماغ بت شکنوں کی شکل میں پیش کیا ہے جو مصیبت زدہ ہندوؤں کو اسلام قبول کرنے یا تلوار سے گردن کٹا دینے پر مجبور کرتے تھے۔

ان حالات میں یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگ بچپن سے ہی اس زہر کو پی پی کر ایک دوسرے کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہندوؤں کو باور کرایا جاتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا مسلم دور جو آٹھ سال سے بھی زیادہ مدت پر محیط ہے، ایک بدترین خواب ہے۔ ایک عام قاری کسی طرح بھی اس زمانہ پر کوئی فخر محسوس نہیں کرتا بلکہ اس طویل درمیانی مدت کو نظر انداز کر کے اس سے قبل کے سنہرے زمانہ

کی خیالی تصویر بنانے لگتا ہے۔ (اورنگ زیب۔ایک نیاز اویہ نظر۔از ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد بحوالہ پی،این،پانڈے)
۔۔۔آخر ہم کب تک تاریخ کو اس کے چوکھٹے سے ہٹا کر آج کی دھول سے اٹے ہوئے آئینہ میں دیکھتے رہیں گے؟ کب تک ہم اپنے من گھڑت افسانوں کو آنے والی نسلوں کے لیے تاریخ کی صورت میں پیش کر کے انسانوں کو جانوروں کی طرح آپس لڑاتے رہیں گے؟ (ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد۔حوالہ بالا پیش لفظ از مصنف)

مذکورہ بالا عبارت ہندوستانی تاریخ کے ماہر و محقق ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد کی تحقیقی کتاب ''اورنگ زیب ایک نیا درشٹی کوڑ'' نامی کتاب سے لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد نے دسمبر ۱۹۸۶ء میں اورنگ زیب کے بارے میں اپنا تحقیقی مقالہ خدابخش لائبریری پٹنہ میں تین۔چار سو اسکالرز کے سامنے پیش کیا جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد ۱۵ ر دسمبر میں سیوان میں پیدا ہوئے، ایم۔اے۔ایل۔ ایل۔بی، پی۔ایچ۔ڈی پٹنہ یونیورسٹی سے کیا اور پھر ۱۹۸۰ء سے پٹنہ یونیورسٹی کے ڈگری درجات سے متعلق شعبۂ تاریخ میں تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں، فن تاریخ میں نصف کی تحقیقی درجہ سے زائد تصانیف ہیں، اور یہ سب کی سب مصنف کی تحقیقی کاوشیں ہیں۔جن میں متعصب تاریخ دانوں، ڈاؤسن، اور سر جادو ناتھ سرکار پر بھروسہ کرنے کے بجائے حقیقت کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے خواہ وہ تعصب کی عینک سے دیکھنے والوں کے لیے کتنا ہی تلخ ہو۔

اورنگ زیب عالمگیر ہندوستانی تاریخ کی ایک مظلوم شخصیت ہے، موصوف نے اپنی کتاب ''اورنگ زیب ایک نیا درشٹی کوڑ'' میں مستند حوالوں کی روشنی میں اورنگ زیب کی صحیح تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اورنگ زیب کی تصویر بگاڑنے والے عوامل پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: ''اورنگ زیب کے خلاف سب سے زیادہ متعصبانہ رویہ انگریزی عہد کے مؤرخوں نے اپنایا اور ایلیٹ اور ڈاؤسن نامی دو انگریز مؤرخوں نے۔۔۔اسے مغلیہ عہد کا سب سے خراب بادشاہ ثابت کرنے کے لیے۔۔۔اور اس کی شخصیت میں داغ لگانے کے لیے غلط اور چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر تاریخ کے ساتھ سخت ناانصافی کی''۔مصنف کتاب آگے لکھتے ہیں کہ ''مشہور تاریخ داں سر جادو ناتھ سرکار کی لکھی ہوئی ہندی اور انگریزی زبانوں میں

کتابیں موجود ہیں۔ ویسے ''سر'' کا خطاب انگریزوں نے زیادہ تر ایسے لوگوں کو دیا جنہوں نے انگریزوں کے خیالات اور بہبودی کا خیر مقدم دل کھول کر کیا''۔۔۔۔ محقق مقالہ نگار آگے لکھتے ہیں کہ ''آشر وادی لال، ایشوری پرشاد، شری رام شرما، آرسی مجوم دار اور وی ایس اِسمتھ وغیرہ جیسے مؤرخوں نے بھی وسطی عہد پر کچھ کتابیں لکھی ہیں، لیکن اورنگ زیب پر لکھتے وقت ان مؤخورں نے بھی اپنے ''جانبدارانہ'' رویہ کا اظہار جانے یا انجانے میں اس انداز سے کیا کہ پڑھنے والے نے اسے ایک کٹر مسلمان اور ظالم بادشاہ ہی سمجھا''۔

وہ آگے لکھتے ہیں ''لیکن ۱۹۶۰ء کے آس پاس ہمیں کچھ ایسے غیر جانبدار اور صاف ذہن مؤرخوں کی لکھی ہوئی تحریریں اور کتابیں ملتی ہیں جن میں اورنگ زیب کے بارے میں کافی غیر جانبدارانہ باتوں کا علم ہوتا ہے۔ جن میں عرفان حبیب، ایس نورالحسن، پربنس کھیا، اطہر علی اور ستیش چندر وغیرہ کے نام کافی اہم ہیں''۔

مصنفِ کتاب ڈاکٹر ادم پرکاش پرساد نے بھی اپنے خدا بخش لائبریری والے خطبات میں اس بات پر کافی زور دیا ہے کہ اب اورنگ زیب کے بارے میں ان حقائق کو بھی روشنی میں لانا چاہیے جنہیں اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ (دولفظ از مصنف)

مصنف ڈاکٹر ادم پرکاش پرساد کی کتاب ''اورنگ زیب ایک نیا درشٹی کوڑ'' پوری کتاب قابل مطالعہ ہے۔ آئندہ شماروں میں بھی اس کے جستہ جستہ اقتباسات پیش کئے جاتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تحفظ ایمان کا واحد ذریعہ دینی تعلیم

دینی مدارس کے سلسلہ میں میرا ایک خاص نظریہ ہے کہ میں فی زمانہ اسلام اور اعمال و ارکانِ اسلام کے تحفظ اور بقاء کے لیے واحد ذریعہ دینی تعلیم اور اس کے اجراء کے لیے مدارس کے قیام کو سمجھتا ہوں، دنیا میں ہر حکومت اپنی سرحد تک کے تحفظ کے لیے فوج اور ضروری قسم کے آلات رکھنا ضروری سمجھتی ہے اور قلعوں کے تحفظ اور استحکام پر اپنی بجٹ کا ایک معتد بہ حصہ خرچ کرتی ہے، کاش! کہ مسلمان بھی ان مدارس کو دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ تسلیم کریں اور اس کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرنے پر آمدنی کا کچھ حصہ بطور اسلامی بجٹ کے اس پر خرچ کریں۔ (مولانا محمد اسماعیل، کٹک امیر شریعت، اڑیسہ)

(۱)

سائنس اور اسلام

سمجھا انہوں نے نیچر و تدبیر کو خدا

از حکیم فخر الاسلام الہ آبادی

"قل الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی االلہ خیر اما یشر کون"
آپ کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام نازل ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا ہے۔ کیا اللہ واحد ذوالجلال بہتر ہے یا وہ جس کو یہ لوگ شریک ٹھہراتے ہیں۔

"او لم یروا کیف یبدء ا لخلق ثم یعیدہ ان ذالک علی اللہ یسیر"
(پارہ ۲۰ رکوع ۱۴)

"خود اپنی ذات میں غور کرو، پہلے تم کچھ نہ تھے۔ اللہ نے تم کو پیدا کیا، اسی طرح مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کر دے گا"۔

ایک طرف تو خالق کائنات کا یہ ارشاد، دوسری طرف الحادی فلسفہ سے مرعوب و متاثر ایک مسلمان بھی یہ کہنے لگے کہ "ابتدا میں لفظ تھا اور لفظ ہی خدا ہے" تو کس قدر تعجب کی بات ہے۔ یہ بات کہاں سے نکلی اس کا پس منظر ذکر کرنا ضروری ہے اور وہ پس منظر مادہ کا الحادی نظریہ ہے۔

مشائیہ کہتے ہیں کہ عالم عناصر کا مادہ اور ہیولٰی ایک ہے۔ اور مادہ عناصر میں قوانین طبعیہ کے ماتحت بے حد تغیرات ہوئے ہیں۔ جسم نباتی بتدریج ترقی کرتے کرتے حیوان ہو گیا ہے۔ پھر جسم حیوان ترقی کرتے کرتے انسان بن گیا ہے۔

ڈارون (۱۸۰۹۔۱۸۸۲) نے اپنی کتاب "فی اصل الانواع" (On the origin of Speices) میں اس نظریہ کو مدلل کیا ہے۔ اس کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جسم کی ہر نوع خواہ وہ جماد ہو یا نبات یا حیوان بتدریج اپنی صورت بدلتی ہے یعنی ایک نوع سے

دوسری نوع کی طرف نشو و انشقاق (Evolution) کے طرز پر پھوٹتی اور ظاہر ہوتی ہے، اور سابقہ شکل سے ترقی کرتی ہوئی موجودہ شکل تک پہنچتی ہے۔ یہ نظریہ ارتقاء کہلاتا ہے۔ (معین الفلسفہ)۔۔۔ اور اس کی بنیاد مادہ کے متعلق وہ تصور ہے جس کو دیمقراطیس نے پیش کیا تھا، اور جس کو ۱۹ ویں صدی کے اوائل میں مشہور ماہر کیمیاء جان ڈالٹن نے مدلل کر کے سائنس کا مسلمہ بنا دیا۔ (مذہب اور سائنس۔ از مولانا عبدالباری ندویؒ)

فلسفیوں اور سائنسدانوں کا خیال یہ تھا کہ مادہ ایک جسم ہے اور چھوٹے سے چھوٹا ذرہ ہے جو ایک محدود فضا کو بلا شرکت غیرے احاطہ کرتا ہے اور جس کی مزید تقسیم ممکن نہیں اور یہ ایسے ناقابل نفوذ ہیں کہ ان میں اندر باہر کی کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ اور اسے کم و بیش یا معدوم بھی نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ انسان کے پاس کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اسے پیدا یا فنا کر سکے۔ (مذہب اور سائنس از مولانا عبدالباری ندویؒ)

انہیں کو ''اجزاء دیمقراطیسی''، ''اجزاء لا یتجزیٰ'' اور ''ایٹم'' کے ناموں سے موسوم کیا گیا، اور انہیں کو کائنات کی بنیادی اینٹیں تصور کیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ کسی فاعل اور موثر کے بغیر ایک مادہ دوسرے مادہ سے مل کر مرکبات کی تشکیل کر لیتا ہے اور یہ از خود موئثر ہو کر جان، ذہن، عقل، شعور سب کچھ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کو قانون فطرت (Law of nature) کا نام دیا گیا۔ لیکن ۱۹ / ویں صدی کے آخر میں بعض ایسی تحقیقات ہوئیں جن سے نہ صرف ایٹم کی تجزی و تقسیم عمل میں آ گئی بل کہ مادہ کے متعلق سابقہ نظریہ باطل ہو کر رہ گیا۔ اور اس سلسلہ میں جو سب سے اہم دریافت ہوئی، وہ لاشعاعوں (X-rays) کا انکشاف تھا، جو جسم و جسمانیت سے آزاد ہوتی ہیں۔ دریافت سے پتہ چلا کہ یہ اجسام کے اندر تک غیر معمولی نفوذ (Penetration) کی قوت رکھتی ہیں۔ (مذہب اور سائنس از مولانا عبدالباری ندویؒ)۔۔۔ سب سے پہلے ریڈیم اور یورینیم جیسی دھاتوں کے تجزیہ سے یہ معلوم ہوا کہ ان سے تین قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں، جن کا نام الفا بیٹا اور گاما رکھا گیا، انہیں کو آگے چل کر الکٹران (Electron) کے نام سے موسوم کیا گیا، یہ الکٹران (برقی پارے) چھوٹے سے چھوٹے معلوم ایٹم سے بھی ہزاروں گنا چھوٹے ہوتے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق ہر برقی ذرہ کی کمیت (Mass) ہائڈروجن (H2) کے ایٹم کی ۱۸۴۵/ ۱ ر ہوتی ہے۔ ان کا مرکز مثبت برق کی اکائیاں ہوتی ہیں، جن کو پروٹان (Proton) کہا جاتا ہے۔ پھر الکٹران اور

پروٹان کے انکشاف کے بیس سال بعد سالمی ذرات کی ایک اور قسم کا پتہ چلا جس کو نیوٹران (Nutron) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اور اس کے صرف دو سال بعد انہیں ذرات کی ایک نئی قسم دریافت ہوئی جسے پازیٹران (Positron) کا نام دیا گیا۔ اور اس کے بعد تو پھر یہ ہوا کہ سارا مادہ اور اس کے مادی سالمات (ایٹم) منفی اور مثبت برق پاروں (Electric charges) میں تحلیل ہوکر رہ گیے اور یہ ثابت ہوا کہ پوری کائنات میں جہاں کہیں جس قسم کا بھی کوئی ایٹم یا مادہ پایا جاتا ہے وہ انہیں برق پاروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

۔۔۔﴿مادہ کے متعلق خیال تھا کہ وہ ایک مجسم شیٔ ہے جو ایک محدود فضا کا بلا شرکت غیرے احاطہ کرتی ہے اور اس کا ایک مستقل وزن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس روشنی اور توانائی کے متعلق یہ خیال تھا کہ نہ تو وہ کوئی مجسم شیٔ ہے، نہ ہی اس کا کوئی وزن ہوتا ہے۔ اور وہ ذرہ کی طرح حرکت بھی نہیں کرتی بل کہ موجوں کی طرح آگے بڑھتی ہے۔ یعنی مادہ اور توانائی ایک دوسرے سے متضاد سمجھ لیے گیے تھے۔ لیکن بعد کی تحقیقات میں یہ ثابت ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کی مختلف شکلیں ہیں۔ مادہ توانائی میں تبدیل ہوجاتا ہے اور توانائی مادہ میں۔ مادہ کے توانائی میں تبدیل ہونے کے اصول پر ہی ایٹم بم بنایا گیا﴾۔۔۔

قوانین فطرت (Law of nature) اور قانون ارتقاء (Evolution theory) کی رو سے چوں کہ سمجھا یہ گیا تھا کہ مادہ اور زمان ومکان تو اساسی حقائق ہیں، باقی اور جو کچھ بھی نبات، حیوان، انسان، ذہن، عقل، شعور وغیرہ ہیں، سب انہیں سے ماخوذ اور انہیں پر مبنی ہیں۔ اور یہی یقین کرلیا گیا تھا کہ کائنات کی ابتداء میں مادی سالمات ہی تھے جو زمان ومکان میں مارے مارے پھرتے تھے، خاص خاص طبعی قوانین کے تحت انہیں سالمات نے بالآخر زمین کی صورت اختیار کرلی، اور اس طبعی عمل کے دوران میں ہی ایک خاص سطح یا منزل پر زندگی کا ظہور ہوا، اس کا مزید ارتقاء حیات حیوانی کے ظہور کا موجب ہوا۔ اور یہ تدریجی ارتقاء ادنی جانوروں سے اعلیٰ حیوانات اور بالآخر بندر پرآ کر ختم ہوا۔ مگر جیسا کے اوپر ذکر کیا گیا کہ تحقیقات کے بعد مادی سالمات، برق پاروں میں تحلیل ہوگئے۔ تو مادہ کے جسم وجسمانیت سے آزاد (Disembodied) برق پاروں (Electric charges) میں تحلیل ہوجانے کے بعد ڈارون کا نظریہ بری طرح متاثر ہوا اور اس کی کوئی اصل نہ رہ گئی۔ کیوں کہ یہ سوال ان مادہ پرستوں کو بھی پریشان کرنے لگا کہ بے حس وحرکت مادہ کے اندھے عمل کے نتیجہ میں نشو وارتقاء کا عمل اور حیات وروح کی پیدائش کیونکر ہوسکتی ہے جب کہ خود مادہ کی اساسی حیثیت مشتبہ ہے۔ اور یہ خیال خود انہیں لوگوں کے تحت الشعور میں

گونجنے لگا جو خالص مادہ پرستانہ ذہنیت کے حامل تھے کہ اساسی حیثیت بجائے مادہ کے کسی روحانی قوت کی ہونی چاہئے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی علم حیات کے ماہر ایک بڑے سائنسداں لارڈ مارگن نے فجائی ارتقاء (Emergent evolution) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریہ کی رو سے ایک مستقل روحانی (Spiritual) اصل یا مبدأ ایسا پایا جاتا ہے جو مادے سے تعلق پیدا کر کے عمل ارتقاء کی رہنمائی کرتا ہے۔ یعنی ارتقاء کے دوران میں اس کے مختلف مراتب ومدارج پر جو نئے خواص وصفات ابھر آتے ہیں وہ ڈارونی ارتقاء کے مطابق کسی مادی یا میکانی اندھے بہرے عمل (Blind interplay of physical and chemical forces) کا نتیجہ نہیں ہوتے بل کہ مارگن اس کو کسی پس پردہ روحانی فاعلیت (Spiritual agency) کا کارنامہ قرار دیتا ہے۔ ایک اور بڑے سائنسداں ہنری برگسان کا خیال بھی تقریباً یہی ہے۔ وہ روحانی فاعلیت کو (Vital Impulse) کا نام دیتا ہے۔

برگسان اور مارگن دونوں ہی کے نظریات کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ خود بے جان و بے حس مادہ سے جان وذہن اور نفس وشعور کا پیدا ہو جانا کسی طرح نہ فلسفہ کی راہ سے سمجھ میں آنے والی بات ہے اور نہ سائنس کی، جب تک کوئی ذی حیات اور روحانی مبدا خود مادہ کے ماوراء نہ پایا جائے جو خود مادہ میں فاعل اور مؤثر کا رول ادا کرے۔

یہی وہ مرحلہ ہے کہ جہاں پر ایک خالق اور مدبر امر کا تصور ملحد کے لیے بھی ناگریز ہو جاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ''سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَ فِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ انه الْحَق ''۔ ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے کائنات میں بھی اور خود ان کی اپنی جانوں میں بھی تا کہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ کلام سچا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ذی حیات کی طبعی ساخت اور منافع الاعضائی افعال کا مطالعہ ومشاہدہ، ہر عضو، ہر نسیج اور ہر خلیہ کی حیرت انگیز تنظیم، اتھاہ معنویت اپنے صانع کے وجود اور اس کے بامقصد تخلیق کی کیا گواہی نہیں دیتا۔ ''ان فی ذلک لآیت لقوم یتفکرون'' بلاشبہ اس میں سوچنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ بل کہ اس کے بعد تو ایک حق کا جویا انسان بے اختیار پکار اٹھتا ہے، ''رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا ''۔ (اے ہمارے رب! یہ چیزیں تو نے بے کار پیدا نہیں کیں)۔

نیوٹن کا قانون تجاذب بھی قوانین فطرت کی حمایت اور انکار خدا کے ذیل میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب نیوٹن نے سترھویں صدی میں قانون تجاذب کا انکشاف کیا اور علم حرکت کی تدوین کی تو ان قوانین کا اطلاق نہ صرف روئے زمین پر پیش آنے والے واقعات پر کیا گیا، بل کہ نظام شمسی کے سیاروں اور دوسرے مظاہر پر بھی اس کو وسعت دی گئی۔ اس کے بعد تو یہ ہوا کہ کائنات کی توجیہ میں سرگرداں ماہرین کو انکار خدا کی گویا ایک سند ہاتھ آگئی، چناں چہ فرانس کے مشہور ریاضی داں لاپلاس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اس کائنات کی میکانکس ایک ہی ہوسکتی ہے اور اس میکانکس کو نیوٹن نے دریافت کرلیا ہے، جس کے بہ موجب کائنات میں علت ومعلول کا ایک سلسلہ کارفرما ہے، اسی کی بنا پر اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تشکیل بھی ہو رہی ہے، اور اس طرح نہ تو کسی خالق کی ضرورت ہے اور نہ قیوم کی۔ اور Religion without Revelation کے حوالے سے جولین ہکسلے کی یہ دریدہ دہنی بھی ملاحظہ کے قابل ہے کہ "نیوٹن نے دکھادیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے، جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو"۔ (مذہب اور سائنس) نیوٹن کے فلسفے سے خدا بیزاری کی سند اور تائید کس طرح ہاتھ آئی اس کی بھی حقیقت سنئے۔ اصل میں نیوٹن کی میکانکس کا ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر کسی شئ کی موجودہ حالت معلوم ہو تو اس کی سابقہ یا آئندہ حالت قطعی طور پر متعین ہو جائے گی، اور محض قوانین حرکت کی بنا پر علم ریاضی کی مدد سے ازل سے ابد تک اس کی تمام حالتوں کی پیش بندی کی جاسکے گی۔ نیوٹن کی میکانکس میں علت ومعلول کا یہی مسئلہ تھا جو مادہ پرستوں کے لیے حکم فیصل کا کام دیتا تھا۔ اور جس کی بنا پر وہ کسی خالق کائنات کے تصور کو غیر ضروری قرار دیتے تھے، کیوں کہ ان کے نزدیک کائنات کی ہر حالت ہر لحہ متعین ہے اور اس کے مطابق وہ خود بخود تشکیل پاتی چلی جارہی ہے۔ (مذہب اور سائنس)

انکار وحدہٗ لاشریک پر مبنی اس الحادی فلسفہ کے باوجود جہاں تک نیوٹن کی ذات کا تعلق ہے وہ خود اس مسئلہ میں شدید خلجان اور ارتیاب کا شکار تھا کہ آخر بے جان و بے حس مادہ کسی فاعل اور مؤثر کے واسطے کے بغیر کیوں کر دوسرے مادے پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ نیوٹن اپنے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس نتیجہ پر تو پہنچا تھا کہ اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، مگر اجسام کیوں کر ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، چناں چہ خود نیوٹن نے اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کی کوئی توجیہ نہیں

پیش کر سکتا اور اپنا قصور فہم اور اعتراف جہل اسی نیوٹن نے جس نے کائنات کی میکانکس دریافت کر لی تھی اور جس نے ہکسلے کے زعم کے مطابق دکھا دیا تھا کہ سیاروں کی گردش پر حکومت کرنے والا کوئی خدا نہیں ہے، اپنی ایک تحریر میں ظاہر کیا۔ اپنے دوست بنٹلی کو ایک خط میں اس نے لکھا کہ "یہ ناقابل فہم ہے کہ بے جان اور بے حس مادہ کسی درمیانی واسطے کے بغیر دوسرے مادہ پر اثر ڈالتا ہے حالاں نکہ دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا"۔

(اسلام اور جدید چیلنج از وحید الدین خاں)

عمریں گزریں صدیاں بیتیں، ہے وہی اب تک عقل کا بچپن
علم ہی ٹھہرا علم کا باغی عقل ہی نکلی عقل کی دشمن

ایک ہی شخص کے وضع کیے ہوئے نظریہ اور اس کے قلبی ادراک میں ایسا زبردست تضاد، اس علم و عقل کی ایک ادنی مثال ہے جو وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہو۔

انسانی تاریخ میں ترقی علم کے تین مرحلے:

(۱) الٰہیاتی مرحلہ (Theological stage) جب کہ واقعات عالم کی توجیہ خدائی طاقتوں کے حوالہ سے کی جاتی تھی۔ (۲) مابعد الطبیعاتی مرحلہ (Meta Physical stage) جس میں واقعات کی توجیہ کے لیے خارجی عناصر (روح وغیرہ) کا حوالہ دیا جاتا تھا، متعین خدا کا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ (۳) ثبوتی مرحلہ (Positive stage) جب کہ واقعات کی توجیہ ایسے اسباب کے حوالہ سے کی جانے لگی جو مطالعہ اور مشاہدہ کے عام قوانین کے تحت معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں کسی روح یا خدا کا نام نہیں آنے دیا جاتا۔ آگسٹ کامٹے (August Camte) نے فکر انسانی کو تاریخی طور پر انہیں تین مرحلوں میں ذکر کیا ہے۔ اس فرانسیسی مفکر کے نزدیک اس وقت فکر انسانی تیسرے مرحلہ سے گذر رہی ہے، جس کی ابتدا تو بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن پروان چڑھی یہ بیسویں صدی کے نصف اول میں جب کہ اس نے تحریک کی شکل اختیار کر لی اور فلسفہ میں اپنا نام منطقی ثبوتیت (Logical positivism) یا سائنسی تجربیت (Scientific Empericism) اختیار کیا۔ اس فکر و فلسفہ کی رو سے "حقیقی علم صرف وہی ہو سکتا ہے جو تجربہ اور مشاہدہ میں آیا ہو"۔ (اسلام اور جدید چیلنج)

لیکن تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں انسان کی حقیقت سمجھنے اور کائنات کی توجیہ تلاش

کرنے میں یہ محققین ومفکرین کس قدر درماندہ اور بے بس ہیں اس کا ثبوت آپ نے اوپر دیکھ لیا کہ جس چیز پر مطالعہ اور مشاہدہ کے عام قوانین (Law of nature) کی بنیاد اور اساس تھی یعنی مادہ اور ایٹم۔ تجربہ اور مشاہدہ سے وہ بنیاد ہی منہدم ہو کر رہ گئی اور خود قانون کشش دریافت کرنے والا اور زمین، آفتاب، سیاروں، ستاروں کی گردش کا قانون وضع کرنے والا تجربہ اور مشاہدہ تو کر رہا ہے کہ اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ لیکن اجسام کیوں ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر پاتا۔ اور ان کی توجیہ تو کیا پیش کر پاتا، اس خدا بیزار انسان کو اپنی حقیقت کا بھی عرفان نہ ہو سکا اور اپنے مقصد وجود کو آج تک طے نہ کر سکا۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ سائنس اور فلسفہ دونوں اپنے موضوع سے ہٹ کر وہ کام کر رہے ہیں جو وہ کر نہیں سکتے، کیوں کہ سائنس کا سارا علم اس سے متعلق ہے کہ ''جو کچھ ہے وہ کیا ہے؟ یہ بات اس کی دسترس سے باہر ہے کہ جو کچھ ہے وہ کیوں ہے؟'' سائنس کی تمام دریافتیں ہونے والے واقعات کو بتاتی ہیں۔ یہ واقعات کیوں ہو رہے ہیں؟ اور ان کا آخری سبب کیا ہے؟ اس کا جواب ایسی دریافتوں کے اندر نہیں ہے جو آزاد عقل کے ماتحت کی جائیں (جس کا نام قرآن کریم کی اصطلاح میں ہوئی ہے)۔ ہاں! ان واقعات میں سوچنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں ''**ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون**'' جو خالق و مالک کا یقین دل میں بٹھاتی ہیں اور خدائے واحد کے وجود کی گواہی دیتی ہیں۔ ایک امریکی ماہر حیاتیات Cecil Boyce Humani نے اسی حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے:

''غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب وغریب خودکار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گزرتی ہے اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مشاہدہ کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعہ عمل

کرتا ہے، جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا ہے"۔
ایک خالق و مالک ہے جس نے زندگی کو وجود دیا۔ اس ضرورت کے تسلیم کر لینے کے بعد اب تخلیق اشیاء کی توجیہ قانون فطرت کے ذریعہ کسی حال میں نہیں کی جا سکتی۔ سائنسداں موصوف کے الفاظ میں:

فطرت کائنات کی توجیہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لیے توجیہ کی طالب ہے۔

"Nature does not explain, she is herself in need of an explanation" ۔ (اسلام اور جدید چیلنج)

ایک طرف تو سائنسی تجربیت کی یہ نارسائی اور ناپائیداری جسے آپ نے ملاحظہ کر لیا۔ دوسری طرف علمی دنیا کا یہ بھی ایک عجیب اتفاق ملاحظہ فرمایئے کہ جب نیوٹن کے نظریوں پر مبنی طبعیات انیسویں صدی میں اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی۔ عین اسی زمانہ میں پے در پے چند ایسے تجربے اور مشاہدے ہوئے کہ خود اس علم کی بنیادیں ہل گئیں، اور علم طبعیات میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہوا۔ مادہ اور توانائی، ذرہ اور موج، جوہر اور عنصر، زمان و مکان اور علت و معلول جیسے بنیادی تصور ہی سرے سے بدل گیے۔ ان تغیرات نے نیوٹن اور میکسول کی طبعیات کے بجائے اس جدید طبعیات کی تشکیل کی جس کی بنیاد کوانٹم اور اضافیت کے نظریوں پر رکھی گئی۔ پہلے جو یہ تصور قائم تھا کہ "کائنات کی ہر حالت ہر لحہ متعین ہے اور وہ اس کے مطابق خود بخود تشکیل پاتی چلی جارہی ہے، ماکس پلانک اور آئنسٹائن کے نظریہ اضافیت کی روشنی میں پروفیسر ہائی زن برگ نے یہ بتایا کہ کسی ایک ذرہ کا بھی مستقبل قطعی طور پر متعین نہیں ہے۔ اور اس طرح ایک نئے اصول کا انکشاف ہوا جس کو اصول عدم تعین (Principle of indeterminacy) کہتے ہیں۔ اس کی رو سے کائنات کی حالتوں پر قطعیت کے ساتھ حکم لگانا اور ان کی پیش بندی کرنا، یہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے جو بھی خدا ہو۔ آئنسٹائن۔ There is a matter which lies on the knee of gods, where gods there be.The evolution of physics۔ (مذہب اور سائنس)

مادی ذہنیت کے افراد کا یہ المیہ ہے کہ وہ غیر مادی اشیاء مثلاً نفس، ذہن، فکر، شعور ساری چیزوں کو کسی مادہ کا ہی کرشمہ قرار دیتے ہیں چنانچہ ملحد مادہ پرستوں کا قول ہے کہ فکر،

شعور، سوچ سمجھ اور اختیار وارادہ سب کا محل دماغ ہے، اور نفس کے متعلق (جو کہ ایک غیر مادی شئی ہے) اس طرح توجیہ کرتے ہیں کہ اس دماغ کے اربوں خلایا (Cells) کا جو عمل جاری ہے نفس اسی کا ظہور ہے۔

مادہ پرستوں کے اس خیال کی بنیاد آرتھ کیتھ جیسے ملحدین کی یہ فکری پرواز ہے کہ ''جاندار مادہ کی سادہ سے سادہ شکل میں بھی حسّی قوت (Sentient Power) موجود ہے جو شعور نفس کی ابتدا ہے'' اور نفس (Mind) کا دماغ سے وہی تعلق ہے جو ہنسی کا چہرہ کے عضلات سے چہرہ کو مفلوج کر دو تو ہنسی بھی غائب ہو جاتی ہے، اسی طرح دماغ سے آکسیجن نکال دو تو نفس کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے''۔ اس سے ثابت ہوا کہ نفس بھی ایک مادی شئی ہے۔

اس خیال کا حقیقت سے کیا تعلق ہے اس کا حال بھی موصوف کے ہی ایک معاصر سرالیور لاج (Sir Oliver lodge) جیسے محقق سے سر آرتھر کیتھ کی ہی زبانی سنئے!

''میرے دوست سرالیور لاج جو مادے کی ساخت کا علم مجھ سے زیادہ رکھتے ہیں، ان کی رائے میں نفس اپنی حقیقت میں مادی نہیں بل کہ کوئی غیر مادی شئی ہے، جو انسانی دماغ کو عارضی طور پر کچھ دن کے لیے اپنا گھر بنا کر موت کے وقت اس سے آزاد ہو جاتی ہے''۔ (مذہب اور سائنس)

اب لیجیے! یعنی نفس کوئی مادی شئی نہیں بل کہ اپنی ذات میں اصل ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ نفس کا وجود دماغی فعل (خلیات کے عمل) کا نتیجہ ہے، یا نفس ہی اصل ہے، اور دماغ اس کے افعال کے ظہور پذیر ہونے کا محض ایک ذریعہ اور آلہ ہے۔ تو اس سلسلہ میں ایک اور محقق ڈاکٹر برنہارڈ بے وِنک کی تحقیق یہ ہے کہ:

''نہ نفس محض دماغ کا فعل ہے اور نہ دماغ نفس کا محض آلہ کار، بل کہ دونوں کسی نا معلوم تیسری (ذات وحقیقت) کے کارنامے ہیں، اور اسی لیے دونوں باہم کسی نہ کسی طرح مربوط و وابستہ ہیں۔ کیوں کر وابستہ ہیں ہم نہیں جانتے''۔ (ڈاکٹر برنہارڈ)۔ ''**سبحانک لاعلم لنا الا ما علمتنا**'' ''ہم نہیں جانتے''۔ یہی وہ اعتراف ہے کہ اگر بصیرت کے ساتھ کر لیا جائے تو نفس و دماغ ہی نہیں، کائنات کی کسی تخلیق کی بھی توجیہ کسی تیسری ذات (خالق) کے قول ''**کن فیکون**'' کے بغیر ممکن ہی کیونکر ہے۔

بے جان و بے حس مادہ کسی درمیانی واسطہ (تیسری ذات (خالق) کے بغیر

دوسرے مادہ پر اثر ڈالتا ہے، نیوٹن کے لیے یہ بات ناقابل فہم تھی۔ اجسام ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں،لیکن اجسام کیوں ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں؟ نیوٹن اس کی توجیہ بھی پیش کرنے سے قاصر تھا۔ آخر بات کیا ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ ہر علم وفن میں ایک نقطہ ایسا آجاتا ہے،جس کے آگے توجیہ چل نہیں سکتی اور وہاں پہنچ کر صاحب فن کو خاموش ہو جانا پڑتا ہے۔ نیوٹن درخت کے پھل کو ٹوٹ کر زمین پر گرتا دیکھ کر اس کی توجیہ قوت کشش کے وسیع کلیہ سے تو کر دیتا ہے، لیکن بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے جب یہ سوال ہوتا ہے کہ قوت ہی میں یہ قوت کہاں سے آئی اور کیوں کر آئی تو خود نیوٹن کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ ہاں اس اخیر ''کیوں'' کا جواب ہے۔ ''مذہب کی اصطلاح میں خدا سب سے آخری چیز (یعنی واجب الوجود) ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی اور وجود ہے اور نہ اس سے وسیع تر کوئی ہستی۔ ''وسعت کلّ شیءٍ''۔ وہی اول واقدم ہے اور وہی تمام چیزوں کو وجود بخشنے والا (معطی وجود) اور ان میں صفات و تاثیرات پیدا کرنے والا ہے۔ اشیاء میں خواص اور افعال کا پیدا کرنا، پتیوں میں کلوروفل کا شامل کرنا جس سے اس میں سبز رنگ ظاہر ہو اور اسی طرح مادہ میں کشش۔ تجاذب اور ثقل (Affinity & Gravity) کا وقوع پذیر کرنا، یہ سب اسی ذات واجب الوجود کی صفت خلق کا ظہور ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

اب ذرا غور کیجئے اور دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ بات بھی کسی عجوبہ سے کم نہیں کہ ایک طرف تو فلسفیوں اور سائنسدانوں کی تحقیقات واکتشافات نے اور نیز مادی کائنات کے زیادہ گہرے مطالعہ اور فہم نے خدا پر ایمان کے نئے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ لیکن دوسری طرف انسانی حیات کا راز معلوم کرنے اور آفاقی تحقیقات میں سرگرداں ان فلاسفہ اور سائنسدانوں کی روش کا جہاں تک تعلق ہے وہ بہرحال مذہب سے بیزاری ہی ہے۔ آفاق و انفس ہر دو جگہ اللہ کی قدرت کاملہ کی واضح نشانیاں موجود ہیں، جن میں سے ہر نشانی ''مَنْ خَلَقَ'' (کس نے پیدا کیا) کا استفہام واستعجاب قائم کر کے خود اپنے خالق لطیف وخبیر اور رب بدیع السموات والارض کا واضح اعلان کر رہی ہے۔ مگر اس کے بعد بھی جب مادہ کا سحر نہ ٹوٹے تو صحیح چیز نظر آنے کے باوجود صحیح نتیجہ تک پہنچ پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی آنکھوں پر مادہ کا نشہ طاری ہو چکا ہے اور یہ اس سے مسحور ہیں۔ ''انما سکرت اَبصَارُنَا

بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مسحورون" اور رہی اللہ کی قدرت کاملہ کی واضح نشانیاں تو وہ تو اب بھی ان لوگوں کے لیے موجود ہیں جو ان نشانیوں میں غور وفکر کریں، سوچیں۔ ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون۔

لیکن یہاں مسئلہ یہ ہے کہ "ع۔ دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوچتا کچھ بھی نہیں"۔ اور اس کی وجہ سر ولیم جیمس جیسے ماہر نفسیات کے بقول "ارادۂ ایمان کا فقدان ہے" اور قرآن نے تو خود اپنے لیے بھی هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ہی کہا ہے یعنی اگر ارادۂ ایمان نہ ہو تو سر پھروں کو ہدایت قرآن سے بھی نہیں ہوتی بل کہ اس کو پڑھ کر بھی معاندین گمراہ کے گمراہ ہی رہتے ہیں "يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا" خود قرآن کریم کا فرمان ہے کہ اللہ تعالی اس کتاب کے ذریعہ بہت سوں کو گمراہ کرتا اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ ایسی حالت میں ان کی یہ تحقیق وجستجو محض علم برائے علم ہو کر رہ جاتی ہے۔

مانٹریال کی میکگل یونیورسٹی کا اسلامی علوم کا شعبہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔

(لیکن) یہاں کے اساتذہ کی بیشتر تعداد غیر مسلموں پر مشتمل ہے، جنہوں نے اپنی تحقیق وجستجو کا موضوع اسلام اور مسلمانوں کو بنایا ہے اور وہ روزانہ اسلامی علوم کے سمندر میں غوطے لگانے کے باوجود اس سے اپنے ہونٹ بھی تر نہیں کر سکے۔ یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ "علم برائے علم" جو محض جاننے کی حد تک محدود رہ کر ماننے اور جھکنے سے نا آشنا ہو، انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ ایسا علم کائنات میں سب سے زیادہ ابلیس کو حاصل ہے لیکن وہ اسے "کفر" اور "جہنم" سے بھی نہیں بچا سکا۔ اور جو علم انسان کو اپنے خالق ومالک تک پہنچا کر اسے ایمان بھی نصیب نہ کر سکے۔ وہ انسان کے کسی کام کا نہیں۔ بل کہ اگر طلب حق کے بجائے دل میں استکبار اور خود رائی ہو تو اسی کتاب (قرآن کریم) سے ہدایت کے بجائے گمراہی حصہ میں آتی ہے، اور انسان منزل کا پتہ حاصل کرنے کے بجائے اپنی فکری اور عملی بے راہ روی میں اور پختہ ہو جاتا ہے۔ (جہان دیدہ: ۵۸۹ تا ۵۹۴۔ از مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ)

ایک عبرت ناک مثال:

ایک مادہ پرست ملحد وہٹکر چیمبرس (Whittaker Chambers) نے اپنی کتاب شہادت (Witness) میں اپنا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ: "وہ اپنی چھوٹی بچی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر بچی کے کان پر پڑی اور غیر شعوری طور پر وہ اس کے کان کی

طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے اپنے جی میں سوچا: یہ کتنی غیر ممکن بات ہے کہ ایسی پیچیدہ اور نازک چیز محض اتفاق سے وجود میں آجائے۔ یقیناً یہ پہلے سے سوچے سمجھے نقشے کے تحت ہی ممکن ہو سکے گی"۔ اس اعتراف کے باوجود آپ کو حیرت ہوگی یہ سن کر کہ:

"اس نے جلد ہی اس خیال کو ذہن سے نکال دیا کیوں کہ اسے احساس ہوا کہ اگر وہ اس کو ایک منصوبہ مان لے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے منصوبہ ساز (خدا) کو بھی ماننا پڑے گا"۔ (مذہب اور جدید چیلنج)

مقامِ عبرت ہے کہ اشیاء کے ظہور پذیر ہونے، ساخت کے وجود میں آنے اور انواع واشکال کی تخلیق کو طبعی اور کیمیائی طاقتوں کے اندھے عمل (Blind interplay of physical & chemical forces) کی طرف منسوب کرنے والے و ہشکر چیمبرس، ڈیوڈ ہیوم، جولین ہکسلے اور ان جیسے تمام جدید فلاسفہ اور سائنسدانوں کا ذہن کسی تخلیق کے واسطے منصوبہ ساز (خدا) کو ماننے کے لیے بالکل اسی طرح تیار نہیں ہے جس طرح فلاسفہ ملحدین اور مشائین کا قدیم زمانہ میں نہیں تھا۔ بل کہ وہ" ابتدا میں مادہ تھا اور مادہ ہی خدا ہے"۔ کا راگ الاپے جارہے ہیں۔

مذکورہ مثال میں آپ نے دیکھ لیا۔ یہ ضد اور عناد نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ عناد، ارادۂ ایمان کا فقدان اور کفر کی ظلمت کا نتیجہ ہی تو ہے کہ ملحدین نظریہ ارتقاء کے ناقابل ثبوت ہونے کے باوجود اسی سے لپٹے ہوئے ہیں۔ سر آرتھر کیتھ کے الفاظ میں: "نظریۂ ارتقاء ناقابل ثبوت ہے۔ لیکن ہم اسے مانتے صرف اس لیے ہیں کہ اس کا واحد بدل صرف نظریہ تخلیق ہے (یعنی کائنات کے رب واحد ذوالجلال کو ماننا پڑیگا۔ف) اور وہ ناقابلِ فہم ہے"۔ (مذہب اور سائنس)۔ یہی ہے انسان کی وہ ضد اور بھول جس کی سزا اس کو کس قدر بھیانک انداز میں جھیلنی پڑی کہ وہ انسان جس کو خدا نے اپنی خلافت کے شرف سے نوازا تھا، اس کی خدا فراموشانہ بغاوت یا حماقت کی سزا خود فراموشی اور اپنی انسانیت کو بھلا دینے کی شکل میں ملی۔ "نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسَاھُمْ اَنْفُسَھُمْ"۔

قانون فطرت اور نظریۂ ارتقاء کے بارے میں ایک طرف تو یہ مادہ پرستانہ ذہنیت ہے۔ دوسری طرف اسی ذہنیت کی اقتدا و تقلید اب بھی صرف ملحدین ہی کی طرف سے نہیں ہو رہی ہے بل کہ سیکولر تعلیم کے اثر اور اہل زیغ کی صحبت سے بعض مسلمان بھی اسی ذہنیت کی

تقلید کرتے چلے جارہے ہیں۔ ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔ کتاب کا اقتباس پڑھیے اور دیمقراطیس، ڈارون، اور سر کیتھ آرتھر کی روح کو تازگی پہنچایئے۔

کتاب ہے "یونانی ادویہ مفردہ" از حکیم صفی الدین۔ اس پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے پیش لفظ لکھا گیا ہے، جس پر جلی حروف میں تحریر ہے: "ابتداء میں لفظ تھا اور لفظ ہی خدا ہے"۔ اس کے بعد درج ہے: "پہلے جمادات تھے ان میں نمو پیدا ہوئی نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی"۔

کیا سمجھے آپ! ڈاکٹر صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جمادات ترقی کرکے نباتات بن گیے، نباتات میں جبلت پیدا ہوئی (قانون فطرت جاری ہوا) تو حیوانات پیدا ہوئے، اور یہ تدریجی نشو و ارتقاء (Evolution) ادنی جانوروں سے اعلی حیوانات اور بالآخر بندر پر آکر ختم ہوا، اور "جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی" یعنی بندروں میں ہی شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا، اس طرح انسان کے مورث (آباء و اجداد) بندر ہیں۔ یہی وہ فلسفہ ہے جسے ڈارون نے پیش کیا تھا۔ اس موقعہ پر اکبر الہ آبادی کا یہ پر لطف شعر بے ساختہ یاد آ گیا ؎

ڈارون صاحب حقیقت سے بہت دور تھے
ہم نہ مانیں گے کہ مورث آپ کے لنگور تھے

اسی ڈارونی نظریہ کی مذکورہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر صاحب نے تقلید کی ہے۔ "لفظ ہی خدا ہے" جیسے مبہم الفاظ اور مادہ ہی خدا ہے، جیسے مشکوک معنی تک پہنچانے والی تعبیر اختیار کرنے کے بجائے پیش لفظ کی ابتداء حمد و ثناء ذات باری سے کی جاتی تو کیا ہی اچھا تھا۔ نہ لفظ خدا ہو سکتا ہے اور نہ مادہ خدا ہو سکتا ہے۔

لفظ انسانی زبان سے ادا ہونے والے حروف و کلمات ہیں اور وہ حادث اور فنا ہو جانے والے ہیں۔ اسی طرح مادہ بھی فانی ہے، پہلے موجود نہیں تھا پھر ازلی و ابدی ذات، وحدہٗ لاشریک کے قول "کن" سے وجود میں آیا۔ مادہ ہی کے مماثل چیزیں روشنی اور برق، قوت اور توانائی اور زمان و مکان بلکہ وقت بھی ہیں۔ اور یہ سب فنا ہو جانے والی چیزیں ہیں۔

ڈارون اور اس کے متبعین ارتقاء کے قائل اور اس کے حامی ہیں۔ ملحدین، مادہ کو قدیم یعنی ازلی وابدی مان کر اور مادہ کے ساتھ اس کے خواص، افعال اور حرکات کو قدیم تسلیم کر کے خدا کا انکار کریں تو کریں، لیکن کسی مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ خالق و باری نے جس انسان کی تخلیق اپنے ہاتھوں سے کی اور زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر اتارا، اس کی اصل بے شعور حیوانات کو بتائے۔

عروج ماہ کو انسان سمجھ گیا لیکن
ہنوز عظمت انسان سے آگہی کم ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور ہدایت کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے اپنا نائب بنا کر زمین پر بھیجنے سے پہلے زمین کو ان تمام نعمتوں سے سجا دیا جن کی ضرورت انسان کو قیامت تک پیش آسکتی تھی۔ خواہ وہ مادہ ہو یا توانائی، مستقر ہو یا متاع۔ ''وَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَ مَتَاعٌ إِلٰى حِينٍ''۔

(مولانا محمد ولی رازی۔ البلاغ کراچی۔ جمادی الاخری ۱۴۲۷ھ۔ جولائی ۲۰۰۶ء)

مخلوقات میں اللہ رب العالمین کی طرف سے تدریجی تبدیلی تو ہوئی ہے اور قرآن میں اس تدریجی تغیر و نمو کا نام ربوبیت ہے جو منسوب ہے خالق کائنات کی طرف۔ چناں چہ خالق و مالک نے اپنا اولین تعارف رب العالمین کے ذریعہ ہی فرمایا ہے۔ اور کائنات میں ترتیب وار تخلیق بھی ہوئی ہوگی جیسا کہ متکلمین کا خیال ہے۔ لیکن یہ مخلوق کے پیدا ہونے کے اعتبار سے پہلے اور بعد کا فرق ہے یعنی پہلے جمادات کا وجود ہوا جمادات کے بعد نباتات کا وجود ہوا، پھر ان نباتات کا وجود ہوا جو مرتبہ حیوانی سے قریب تر ہیں۔ پھر حیوانات کا وجود ہوا اور ان حیوانات کا وجود ہوا جن کو انسان کے ساتھ اقوال وافعال میں مشابہت ہے پھر انسان کا وجود ہوا جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی تخلیق کا مظہر اتم ہے۔ اور یہ آفاق والنفس میں سب کی سب اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، اور یہ تمام انواع اپنی تخلیق میں مستقل ہیں۔ کوئی نوع کسی نوع سے پھوٹ کر نہیں نکلی۔ یعنی ایسا نہیں ہوا ہے کہ جماد سے نبات، اور نبات سے حیوان اور حیوان سے اعلیٰ درجہ کا حیوان (یعنی بندر یا اس جیسی مخلوق) اور اس سے انسان پیدا ہو گیا ہو۔ یہ نظریۂ ارتقاء ہے جو غلط اور مہمل ہے۔ اور اس نظریہ کے ماننے والے بھی اب اس کے قائل نہیں کہ کسی حیوان سے اعلیٰ درجہ کا حیوان بن جائے یا کسی بندر سے انسان بن جائے۔ اب وہ بھی قانون توارث کو ہی جاری کرتے ہیں یعنی اب انسان سے انسان کا بچہ ہی پیدا ہوگا۔ جب

کہ ایک مومن کی نظر میں تو وہ انسان ابتداء ہی سے انسان ہے۔ غیر انسانی، حیوانی یا نباتی دور تو کبھی اس پر نہیں گزرا۔ پہلے انسان آدمؑ کو اللہ نے پیدا کیا۔ اس کو تہذیب کی تمثال دی اور علوم سے آراستہ کیا (وَ عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰئِكَةِ فَقَالَ اَنْبِئُهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ) ﴿ قرآن کریم کی آیت سے پہلے انسان آدم علیہ السلام کے لیے علوم سے آگہی اور تہذیب یافتگی علی وجہ الاتم ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ فرشتوں کے سامنے پیش ہونے کے لیے یہ دونوں چیزیں ضروری تھیں۔ ایک کا ثبوت عبارۃ النص کے ذریعہ اور دوسری کا اقتضاء النص سے۔ لہٰذا اب اس کی کوئی گنجائش نہیں کہ ''قدیم دور کے انسان کو علم سے بے بہرہ'' یا ''سب سے ابتدائی انسان (''Most primitive man'') کو علم سے ناآشنا'' کہا جائے۔ اصل میں مادہ کے ارتقائی نظریہ اور معلومات کے انتشار اور پھیلاؤ نے غیر شعوری طور پر مسلمانوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ یہ مختصر مقالہ اس کی مثالوں کے لیے متحمل نہیں ﴾۔ پھر آدم علیہ السلام سے نسل انسانی کو پیدا کیا۔ (اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَ نِسَاءً)۔

خدا فراموشی کی سزا خود فراموشی:

اس وضاحت سے ثابت ہو گیا کہ انواع عالم کے پیدا ہونے میں عمل انشقاق یا نظریہ ارتقاء (Evolution) کارفرما نہیں ہے بل کہ تخلیق کا عمل ہے اور تخلیق آدم مستقلاً ہوئی ہے۔ کاش یہ محققین مفکرین لفظ اور مادہ ہی کو خدا بنانے کے بجائے اپنے سینہ میں طلب حق کی کسک پیدا کر کے تفکر فی خلق اللہ (اللہ کی مخلوق میں غور و فکر) کرتے اور خالق و صانع عالم کے وجود کی گواہی دیتے اور ان نشانیوں سے خدا کی معرفت حاصل کرتے تو خود انکے لیے بہتر ہوتا۔ لیکن انہوں نے جب خدا کو فراموش کیا اور مادہ میں ڈوب کر اپنی ملحدانہ نظر و فکر کی ظلمت سے سائنسی اکتشافات کے ذریعہ نظریاتی خدا تراشنا شروع کیا اور اللہ کی توحید، اس کی قدرت کاملہ اور صفت تخلیق کو (''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى'' کے اقرار اور معاہدہ کے باوجود) بھلا بیٹھے تو اس خدا فراموشی کی عبرتناک سزا ان کو خود فراموشی کی شکل میں ملی ''نسوا اللہ فانساھم انفسھم''۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے انسان کو ڈارونی نظریہ کے مطابق ڈھالا، اور کسی نے دو ٹانگوں کا بے پر کا جانور بتلایا، پھر اس ڈارونی انسان نے ذہنی ارتقا اور نطق و

شعور کی جب کئی منزلیں اور طے کرلیں تو اب کوانٹم نظریہ کی روشنی میں خدا کو تلاش کرنا شروع کیا اور مذہب کو بھی سائنسی اکتشافات پر مبنی کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح اب دیکھتے رہیے کہ اس نظریاتی خدا کو کتنے اکتشافات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ان فلسفیوں اور سائنسدانوں کے نظریات اپنی جگہ، ان کی تضاد بیانیاں اور رجوع واعترافات انہیں مبارک۔ لیکن قرآن کی حقانیت اور خدا قاہر وذوالجلال کا وجود اور وحدانیت کسی فلسفی کے نظریہ پر منحصر نہیں جو ڈور کو سلجھاتا رہے اور سرا ہاتھ نہ آئے بقول اکبر الہ آبادی ؎

فلسفی کو بحث میں خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اور کسی سائنسی اکتشاف پر بھی خدا کو مبنی نہیں ٹھہرایا جاسکتا جو کسی نئے سائنسی انقلاب کے سیلاب میں بہہ جائے۔ اس لیے کہ دنیا کسی فلسفی یا سائنسداں کا عطا کردہ خدا بہر حال نہیں چاہتی یہ تو صرف مذہب ہی ہے جو خدا کا صحیح تصور پیش کرتا ہے۔ بقول سر آرتھر ایڈنگٹن ”مذہبی آدمی کے لیے یہ بہت بڑے اطمینان کی بات ہے کہ اس کو میں نے کوانٹم نظریہ کی وحی کا عطا کیا ہوا خدا نہیں پیش کیا ہے جو آئندہ کسی نئے سائنسی انقلاب یا نظریہ کے سیلاب میں بہہ جائے۔ البتہ یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ سائنسی فکر کی حالیہ تبدیلیوں نے مذہب وسائنس میں توفیق وتطبیق کے بعض موانع دور کردیے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مذہب کو کسی سائنسی اکتشاف پر مبنی کر دیا جائے“۔ (مذہب اور سائنس)

کتاب ”ادویہ مفردہ“ کو پڑھنے والے عموماً مومنین اور قائلین توحید ہیں، اور خود ڈاکٹر صاحب بھی مسلم ومومن ہیں۔ لہٰذا ہمارا مشورہ ہے کہ ترقی اردو کے نام پر اس طرح کے فرسودہ فلسفہ کا احیاء نہ کیا جائے۔ **والسلام علی من اتبع الهدی**

ماخذ:

تلخیص الهدایة حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ☆ معین الفلسفہ مولانا سعید احمد پالن پوری
مذہب اور سائنس مولانا عبدالباری ندویؒ
مقدمہ بر مذہب اور سائنس ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (ماہر ریاضی۔ سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی)
حکیم الامت۔ نقوش وتاثرات مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ☆ اسلام اور جدت پسندی مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی
جہان دیدہ مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی
”فہم انسانی“ ترجمہ ہیومن انڈر اسٹینڈنگ مصنف ڈیوڈ ہیوم (مترجم مولانا عبدالباری ندویؒ)
مذہب اور جدید چیلنج وحید الدین خاں ☆ الانتباہات المفیدة حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
علم طبیعات کے عجائبات مولانا محمد ولی رازی (البلاغ کراچی۔ جمادی الاخری ۱۴۲۷ھ۔ جولائی ۲۰۰۶ء ص ۳۶،۳۷)

(۲)

سائنس اور اسلام

"ارتقاء ایک فریب"

(سائنس دانوں کے تجربات واختبارات کی روشنی میں)

(از افادات ڈاکٹر ہارون یحیٰ)

از حکیم فخر الاسلام الہ آبادی

تعالی اللہ عما یشرکون۔ (پارہ ۲۰/رکوع ۱)

کہاں وہ قادر مطلق اور کہاں عاجز وناقص مخلوق و مادہ جسے اس کی خدائی کا شریک جتلایا جارہا ہے۔

ڈاکٹر ہارون یحیٰ صاحب اپنی شہرۂ آفاق کتاب "اللہ کی نشانیاں" میں تحریر فرماتے ہیں: "خود سائنس جس پر یہ نظریہ (ارتقاء) اس قدر انحصار کرتا ہے مسلسل یہ بات پیش کررہی ہے کہ درحقیقت اس نظریہ میں اہلیت کی بنیاد پر زندہ رہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

ارتقا پسندوں نے خود اپنے ہاتھوں (نہ چاہتے ہوئے بھی) ثبوت مہیا کردئے ہیں کہ ارتقاء سرے سے ہوا ہی نہیں کیوں کہ:

"جینیات، خورد حیاتیات اور حیاتی کیمیا کی معلومات حاصل ہونے کے بعد واضح ہوگیا کہ وہ معلومات جو نوع کا تعین کرتی ہے پہلے سے جین میں موجود ہوتی ہے اور فطری انتخاب کے لیے ناممکن ہے کہ وہ جین تبدیل کرکے نئی نوع پیدا کرسکے۔"

("اللہ کی نشانیاں" از ڈاکٹر ہارون یحیٰ، ص ۱۱۰)

۱۹۵۰ء میں ڈی۔این۔اے سالمے کی دریافت نے، جو جینیاتی معلومات تشکیل دیتی ہے، نظریہ ارتقاء کو ایک بہت بڑے بحران سے دوچار کردیا تھا۔ اس لیے کہ ڈی۔این۔اے میں پائی جانے والی بے پناہ معلومات کے ماخذ کو اتفاقیہ طور پر پیش آنے والے واقعات سے واضح کرنا ممکن نہ تھا۔ ("اللہ کی نشانیاں" از ڈاکٹر ہارون یحیٰ۔ ص ۱۱۱)۔

لیکن مذہب سے مخاصمت رکھنے والے دوسرے نظریات اور نظاموں کی طرح اس

نظریہ کوفروغ دینے کے لیے کئی نظریاتی اور سیاسی حلقے اور ادارے سرگرم عمل ہو گیے۔اور اس کی فرسودگی کو ختم کرنے کے لیے ایک نیا ماڈل تشکیل دیا گیا جس کا نام نیو ڈارونیت تھا۔"اس نظریہ کے مطابق وہ نوع جو عمل تغیر کے نتیجہ میں بنتی ہیں جن میں معمولی سی جینیاتی تبدیلیاں آجاتی ہیں، ان میں سے وہ جو زندہ رہنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوں گی وہ فطری انتخاب کے میکانکی عمل کے ذریعہ زندہ رہ جائیں گی۔تاہم جب یہ ثابت ہو گیا کہ نیو ڈارونیت نے جو میکانکی عمل تجویز کئے تھے وہ قابل عمل نہ تھے۔اور جانداروں کے متشکل ہونے کے لیے معمولی تبدیلیاں کافی نہ تھیں، تو ارتقاء پسندوں نے نئے نمونوں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ وہ ایک نیا دعویٰ لے کر آئے جسے "تاکیدی توازن" (Punctuated Equilibrium) کا نام دیا گیا، جس کی بنیاد کسی معقول ثبوت یا سائنسی بنیادوں پر نہیں رکھی گئی تھی۔اس ماڈل نے یہ نقطہ نظر دیا کہ جاندار اچانک عبوری شکلوں کے بغیر کسی دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔۔۔در اصل یہ تخلیق کی وضاحت کا ایک طریقہ تھا، حالانکہ ارتقاء پسند اسے تسلیم کرنے میں تذبذب سے کام لے رہے تھے۔انہوں نے اس حقیقت کو تحفظ دینے کے لیے ناقابل فہم منظر ناموں کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی۔مثلاً انہوں نے کہا کہ پہلا پرندہ تاریخ میں ایک رینگنے والے چھپکلی یا مگر مچھ نما جانور کے انڈے سے اچانک پھدک کر اس طرح نکل آیا ہوگا کہ اس بات کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔اس نظریہ کے مطابق خشکی پر رہنے والے گوشت خور جانور قوی ہیکل مچھلیوں میں تبدیل ہو گیے ہوں گے اور ان میں اچانک اور ناقابل فہم قلب ماہیت ہوئی ہوگی"۔۔۔

نظریہ "تاکیدی توازن" محض تخیل کی پیداوار تھا۔اور بطور ایک جائے فرار کے اختیار کیا گیا تھا۔ ("اللہ کی نشانیاں" از ڈاکٹر ہارون یحییٰ۔ص ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳)

ڈارون نے دعویٰ کیا تھا کہ نوع ایک بتدریج ارتقاء سے گزری تھیں جس نے نصف پرندے اور نصف چھپکلی نما جانور یا نصف مچھلی نما جانور کے اعجوبے کو لازمی بنا دیا تھا۔تاہم ان میں سے کوئی ایک بھی "عبوری شکل" ارتقاء پسندوں کو وسیع تحقیقی مطالعہ اور ہزاروں فوسلز کو کھود کر نکالنے کے باوجود دستیاب نہ ہو سکی"۔۔۔اور۔۔۔"چوں کہ آج ارتقاء پسندوں کو اس بات کا احساس ہے کہ پیچیدہ و مکمل اعضاء مثلاً آنکھیں، پنکھ، پھیپھڑے، دماغ وغیرہ بتدریج ارتقاء کے ماڈل کی صاف صاف تردید کرتے ہیں، اس لیے ان مخصوص مقامات پر وہ تاکیدی

توازن کے ماڈل کی مضحکہ خیز تشریحات میں پناہ لینے پر مجبور ہیں"۔(ایضاً ص ۱۱۴)

تصاویر میں دھوکہ اور فریب:

"ارتقاء پسند محققین تصوراتی مخلوقات کی تصاویر اور خاکے بناتے وقت عموماً ایک دانت یا جبڑے کے ٹکڑے یا بازو کی ہڈی سے مدد لیتے ہیں اور انہیں ایسے سنسنی خیز انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں جیسے وہ انسانی ارتقاء کی ایک کڑی ہوں"۔۔۔

جب ارتقاء پسندوں کو نظریہ ارتقاء کے لیے فوسل ریکارڈ میں قابل تسلیم ثبوت نہ ملا تو انہوں نے اپنے پاس سے اسے گھڑ لینے کی کوشش کی۔ان کوششوں کو انسائیکلو پیڈیاؤں میں "نظریۂ ارتقاء کی فریب کاریاں" کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔۔۔

اس دھوکہ اور فریب میں سب سے بڑے اور بدنام زمانہ فریب دو ہیں: پلٹ ڈاؤن مین(Piltdown Man): چارلس ڈاسن، ایک نامور ڈاکٹر اور غیر پیشہ ور ماہر قدیم حیاتیات، اس دعوی کے ساتھ سامنے آیا کہ اسے ایک جبڑے کی ہڈی اور ایک کھوپڑی کا ٹکڑا پلٹ ڈاؤن، برطانیہ سے ۱۹۱۲ء میں ملا ہے۔یہ کھوپڑی انسانی نظر آتی تھی مگر جبڑا صاف طور پر بندر کا نظر آتا تھا۔ان نمونوں کو پلٹ ڈاؤن آدمی کا نام دیا گیا۔یہ ۵۰۰ ہزار برس پرانے بتائے جاتے تھے اور انہیں انسانی ارتقاء کے واضح ثبوتوں کے طور پر دکھایا گیا تھا۔۔۔۔۱۹۴۹ء میں سائنس دانوں نے ایک بار پھر اس فوسل کا معائنہ کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ فوسل دانستہ طور پر بذریعہ جعلسازی بنایا گیا تھا جس میں کھوپڑی انسانی تھی اور جبڑا ایک انسان نما بندر(Orang.Utan) کا تھا،فلورین کے ذریعہ عرصہ و مدت معلوم کرنے کا طریقہ استعمال کرتے ہوئے محققین نے دریافت کیا کہ یہ کھوپڑی تو چند ہزار برس پرانی تھی۔جبڑے میں جو دانت تھے وہ ایک انسان نما بندر کے تھے جنہیں مصنوعی طریقہ سے پرانا اور قدیم بنایا گیا تھا۔۔۔

ان مفصل تجزیوں میں، جو لوکلے، ویز اور کلارک(Loakley, Weiner, Clark) نے کیے، اس جعل سازی کو ۱۹۵۳ء میں لوگوں پر منکشف کیا گیا تھا۔یہ کھوپڑی ۵۰۰ سالہ بوڑھے انسان کی تھی اور جبڑے کی ہڈی حال ہی میں مرنے والے ایک بندر کی تھی۔دانتوں کو اس کے بعد ایک ہی سیدھ میں ترطیب دی گئی تھی اور پھر جبڑے کے ساتھ جوڑ

دیا گیا تھا اور جوڑوں کو اس طرح پر کر دیا گیا تھا کہ وہ ایک انسان کے دانت اور جبڑے نظر آئیں۔(جب تیزاب میں ڈبویا گیا تو یہ داغ دھبے ڈھل گیے تھے)۔ (ایضاً ص ۱۱۹،۱۲۰)

نبراسکا آدمی(Nibraska Man):

ہنری فیئر فیلڈ اوسبارن(Henry Fair feild Osbern)نے جو امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری کا ڈائریکٹر تھا ۱۹۲۲ء میں اعلان کیا کہ اسے ایک ڈاڑھ مغربی نبراس کا ہینک بروک سے ملی ہے عہد pliocene جدید تر عصر سے تعلق رکھتی ہے۔اس پچلی دانت میں انسان اور بندر دونوں کے پچلی دانت کی خصوصیات ملتی تھیں اس کے بعد سائنسی بحث ومباحثے شروع ہو گیے۔کچھ نے تو اس دانت کو جاوا کے بن مانس کا دانت قرار دیا جبکہ دوسروں کے خیال میں یہ جدید دور کے انسان کے دانت کے ساتھ مشابہت رکھتا تھا۔اسے نبراس کا آدمی کا نام دیا گیا تھا۔کئی صاحب الرائے لوگوں نے اوسبارن(Henry Fair feild Osbern) کی حمایت کی۔اس دانت کو بنیاد بنا کر نبراس کا آدمی کے سر اور جسم کی تصویر بنالی گئی جو یقینا تصوراتی (فرضی۔ف) تھی۔

۔۔۔نو دریافت شدہ ٹکڑوں کے مطابق یہ دانت نہ بندر کا تھا،نہ انسان کا۔اب اس بات کا پتہ چلا تھا کہ یہ دانت تو ایک ایسے سور کا تھا جس کی نسل ختم ہو چکی تھی اور جسے Prosthennops کہتے تھے۔

ارتقاء پسند، انسانی ارتقاء کے اگلے مرحلے کو ہومو(Homo یعنی انسان) کہتے ہیں۔۔۔آج کے جدید انسان یعنی Homosapiens کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اس نوع کے ارتقاء کے آخری مراحل میں متشکل ہوا تھا۔۔تاہم سائنسی حقائق بتاتے ہیں کہ ان فوسلز میں کوئی ارتقائی عمل دکھائی نہیں دیتا اور ان میں سے جن کو انسان کا جدامجد کہا ہے وہ اصلی بندر تھے جبکہ ان میں سے کچھ اصلی انسان ہیں۔(یعنی کوئی بندر انسان نہیں بن گیا۔ف)

انسانی سلسلہ(Homoseries)اصل انسانی:

ارتقاء پسندوں کی تخیلاتی پرواز کے مطابق انسانی سلسلہ کا داخلی تخیلاتی ارتقاء یہ ہے:

(۱) سب سے پہلے سیدھے کھڑے ہونے کا انسانی عمل۔

(۲) جدید دور کے انسان کا عہد قدیم۔

(۳) نیدرتھل آدمی(Neanderthal Man)۔

(۴) کرومیگن انسان(Cromagan Man)۔

اورسب سے آخرمیں(۵) جدیدانسان۔ (ایضاً ص ۱۲۴۔۱۲۵)

کھڑے ہوکر چلنے والے جاندار کے ۲۷ ہزار سالہ فوسل جزیرہ جاوا سے ملے تھے۔آسٹریلیا کے دلدلی علاقہ kow میں ۱۳ر ہزار سالہ فوسلز ملے تھے،جن میں جدید اور قدیم انسان کی صفات پائی جاتی تھیں۔ان تمام فوسلز سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم انسان آج کے اس عہد سے ماضی قریب تک میں زندہ تھا،اور یہ نسل انسانی کے سوا کچھ نہ تھے۔

قدیم انسان اور نیدرتھل آدمی:

''ارتقاء پسند، ان انسانی فوسلز کا حوالہ دیتے ہیں جو ہالینڈ کی نیندر وادی میں زمین کھود کر نکالے گیے تھے۔انہیں نیندرتھل آدمی کہا جاتا ہے۔''۔۔

''اس موضوع پر ایک مشہور اتھارٹی Erik Trinkaus کی ہے جو نیو میکسیکو یونیورسٹی سے وابستہ ہے، وہ لکھتا ہے:

نیندرتھل کے پنجر کی باقیات کا جدید انسانوں کے پنجر کے ساتھ جزئیات کی حد تک موازنہ کرنے سے پتہ چلا ہے کہ نیندرتھل کے اعضاء ایسے ہیں جن میں کوئی بھی اہلیت مثلاً نقل وحرکت، چالاکی وہوشیاری، ذہانت یا لسانی ایسی نہیں جو جدید انسانوں سے کمتر ہو۔
(ایضاً ص ۱۲۶۔۱۲۷)

اس ساری تفصیل سے پتہ چلتا ہے کہ ''انسانی ارتقاء'' کا منظر نامہ جسے ارتقا پسندوں نے جعل سازی سے تیار کیا تھا ان کے تخیل کی پیداوار ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان ہمیشہ انسان اور بندر ہمیشہ بندر ہی تھے۔

کیا زندگی کا وجود اتفاقات کا نتیجہ ہے:

نظریہ ارتقاء کا دعویٰ یہ ہے کہ زندگی ایک ایسے خلیہ سے وجود میں آئی جو اتفاق سے قدیم ارضی حالات کے تحت متشکل ہو گیا تھا۔ (ایضاً ص۔۱۲۷)

''قطع نظر اس بات کے کہ یہ خلیہ قدیم ارضی حالات کے تحت متشکل ہوا، اس کی تالیف اور میکانکی نظام کو ہمارے عہد کی جدید تجربہ گاہوں میں بھی ترکیب نہیں دیا جاسکتا۔خلیہ

کے امینوترشوں (Amino acid) اور تعمیری سہاروں کے استعمال سے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ مکمل خلیہ تو کجا خلیہ کا واحد عضو مثلاً خیطی ریزہ (Mitochondria) یا (Ribosome) ہی بنایا جاسکے۔ پہلا خلیہ جو نظریہ ارتقاء کے دعویٰ کے مطابق اتفاق سے پیدا ہوگیا تھا اسی طرح تصور کی پیداوار ہے جیسے داستانی یا تصوری حیوان۔"

اور صرف ایک ہی خلیہ پر موقوف نہیں:

ان ہزاروں پیچیدہ و جامع لحمیاتی سالموں میں سے ایک کا بھی قدرتی حالات کے تحت اتفاقاً وجود میں آجانا ناممکن ہے"۔

لحمیات بہت بڑے سالمے ہوتے ہیں جو امینوترشوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔" کچھ لحمیات ایسے ہوتے ہیں جن میں ہزاروں امینوترشے ہوتے ہیں۔ جاندار خلیوں میں ایک لحمیے کی ساخت میں کسی ایک امینوترشے کی کمی بیشی یا تبدیلی جن میں سے ہر ایک کا ایک خاص کام ہوتا ہے لحمیے کو ایک بے کار رسالمی ڈھیر میں بدل دیتی ہے۔ نظریہ ارتقاء جب امینو ترشوں (Amino acids) کی "اتفاقیہ تشکیل" کا مظاہرہ کرنے میں ناکام رہتا ہے تو لحمیات کی تشکیل کے معاملے میں بھی اسے مایوسی ہوتی ہے۔ (ایضاً ص ۱۲۸۔۱۲۹)

"اگر ان لحمیات میں سے ایک کا بھی اتفاقاً وجود میں آجانا ناممکن ہو تو ان ایک ملین لحمیات کے لیے ایک خاص ترتیب سے اتفاقاً یکجا ہو جانا کئی بلین مرتبہ زیادہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ ایک مکمل خلیہ کو بنا سکیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک خلیہ کسی بھی وقت لحمیات کا محض ایک ڈھیر نہیں ہوتا۔ لحمیات کے علاوہ ایک خلیہ میں مرکزی ترشے (Nuclei acids) بھی شامل ہوتے ہیں، کاربوہائیڈریٹ بھی، شحمیے (Lipids) وٹامنز اور بہت سے کیمیائی مادے مثلاً برق پاش جو ایک خاص تناسب اور ہم آہنگی سے ترتیب دئے جاتے ہیں، ان کے ڈیزائن میں بھی ساخت اور کام دونوں اعتبار سے ایک خاص تناسب اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

ان میں سے ہر ایک مختلف خلوی اعضاء میں تعمیری سہارے یا ایک جزو ترکیبی کے طور پر کام کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ ایک خلیہ کے کئی ملین لحمیات میں سے صرف ایک کے متشکل ہونے کے بارے میں ارتقاء پسند کچھ نہیں بتا سکتا۔ (ایضاً ص ۱۳۰)

"جانداروں میں موجود لحمیاتی سالمے کے متشکل ہونے کے لیے موزوں امینو ترشوں کا صحیح ترتیب میں ہونا ہی کافی نہیں ہے، اس کے علاوہ ان ۲۰ (بیس) امینو ترشوں میں سے ہر ایک کا بایاں ہاتھ استعمال کرنا ضروری ہے جو لحمیات کی تالیف میں موجود ہوں۔ کیمیائی طور پر دو مختلف قسم کے امینو ترشے ہوتے ہیں جنہیں "بائیں ہاتھ والے" اور "دائیں ہاتھ والے" کہا جاتا ہے۔ ان میں فرق اس mirror Symmetry کا ہوتا ہے جو ان کے سہ جہتی اجسام میں ہوتا ہے جو ایک انسان کے دائیں اور بائیں ہاتھ جیسا ہوتا ہے۔ دونوں قسم کے یہ امینو ترشے نیچر میں مساوی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور وہ بڑی عمدگی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ تاہم حیرت انگیز حقیقت تحقیق کے ذریعہ سامنے آئی ہے (وہ یہ کہ) جانداروں کی ساخت میں شامل تمام لحمیات میں بائیں ہاتھ والے امینو ترشے پائے جاتے ہیں۔ اگر کسی لحمیے کی ساخت میں ایک بھی دائیں ہاتھ والا امینو ترشہ رہ جائے تو وہ اسے بیکار بنا دیتا ہے۔

آیئے! ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ زندگی اتفاق سے وجود میں آ گئی تھی جیسا کہ ارتقا پسندوں کا دعوی ہے۔ اس صورت میں دائیں اور بائیں ہاتھ والے امینو ترشے نیچر میں تقریباً یکساں تعداد میں ہونے چاہئے تھے، لحمیات کس طرح تمام امینو ترشے میں سے صرف بائیں ہاتھ والے امینو ترشے چن لیتے ہیں اور زندگی کے عمل میں ایک بھی دائیں ہاتھ والا امینو ترشہ کیوں شامل نہیں ہو پاتا۔ ارتقاء پسندوں کو یہ سوال بہت پریشان کیے ہوئے ہے"۔

(ایضاً ص۔۱۴۰۔۱۴۱)

برطانیکا سائنس انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ "یہ بتانا ممکن نہیں ہے کہ سالمے بائیں یا دائیں ہاتھ والے کیوں بن جاتے ہیں۔" (ایضاً ص۔۱۴۱)

"۔۔۔۔ ایک لحمیے کی تشکیل یہ بھی چاہتی ہے کہ ایسے سالماتی امینو ترشے جن کا ایک سے زیادہ بازو ہو مختلف بازوؤں کے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے جائیں۔ اس قسم کے ملاپ کو "بیٹا ئنڈ ملاپ" کا نام دیا گیا ہے۔ امینو ترشے ایک دوسرے کے ساتھ مختلف بندھنوں میں جکڑے جا سکتے ہیں، مگر لحمیات صرف اور صرف ان امینو ترشے سے مل کر بنتے ہیں جن کو "بیٹا ئنڈ ملاپ" کے ذریعہ جوڑ دیا جاتا ہے"۔

صحیح طور پر کام کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر وہ امینو ترشہ جو ایک لحمیہ بنا رہا

ہے صرف اس ''بیپٹا ئڈ ملاپ'' کے ساتھ، اسی طرح شامل ہو کہ اسے صرف بائیں ہاتھ والے امینو ترشوں سے انتخاب کرنا ہے۔ بیشک ایسا کوئی کنٹرول میں رکھا جانے والا میکانکی عمل نہیں ہے جس کے ذریعہ انتخاب کرتے وقت دائیں ہاتھ والے امینو ترشوں (Amino acids) کو باقی رہنے دیا جائے، اور ذاتی طور یہ یقین کر لیا جائے کہ ہر امینو ترشہ دوسرے امینو ترشے کے ساتھ ''بیٹا ئڈ ملاپ'' کے ذریعہ یکجا ہو گیا ہے''۔ (ایضاً ص ۱۳۱،۱۳۲)

''ہوموگلوبین'' سالمے جو کہ ایک لحمیہ ہوتا ہے، اس میں ۵۷۴ امینو ترشے ہوتے ہیں۔۔۔انسانی جسم میں ۲۸۰،۰۰۰،۰۰۰ (۲۸۰ ملین) ہوموگلوبین سالمے ہوتے ہیں۔

فرض کیجئے یہی ایک خون کا خلیہ ہے۔ اس کرہ ارض کی عمر ایک واحد لحمیہ کو بھی سعی و خطا (Trial&Error) کے طریقے سے متشکل کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس ساری گفتگو سے نتیجہ یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ارتقاء امکانیت کی ایک خطرناک کھائی میں اس وقت گر جاتا ہے جب ایک لحمیہ متشکل ہو رہا ہو۔ (ایضاً ص ۱۳۳)

تخلیق ناگزیر لیکن ارتقاء پسندوں کا عناد و استکبار قائم:

(ارتقاء پسندوں کی طرف سے تخلیق کی تردید اور اس کے جوابات تلاش کرنے کے لیے) تجربہ گاہوں میں کئی تجربات کئے گیے تھے تاکہ اس سوال کا جواب دیا جا سکے کہ بے جان مادے سے زندگی کیسے وجود میں آ گئی تھی۔ ان تجربات میں سے سب سے زیادہ معروف اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے والا تجربہ ''ملر تجربہ'' یا ''یورے ملر تجربہ'' کہلاتا ہے جو ایک امریکی محقق سٹینلے ملر نے ۱۹۵۳ء میں کیا تھا۔

یہ ثابت کرنے کی غرض سے کہ امینو ترشے اتفاقاً وجود میں آ گیے ہوں گے، ملر نے اپنی تجربہ گاہ میں ایک ماحول تیار کیا جو اس کے خیال میں قدیم کرۂ ارض پر بھی موجود تھا (جو بعد میں غیر حقیقی ثابت ہوا تھا) اور پھر وہ اپنے تجربہ میں مصروف ہو گیا تھا۔ جو آمیزہ اس نے اس قدیم ارضی ماحول کے لیے استعمال کیا اس میں ایمونیا، میتھین، ہائیڈروجن اور آبی بخارات شامل تھے۔

ملر جانتا تھا کہ قدرتی حالات کے تحت میتھین، ایمونیا، ہائیڈروجن اور آبی بخارات ایک دوسرے پر کوئی ردعمل نہیں کریں گے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ردعمل پیدا کرنے کے لیے اسے

آمیزے میں توانائی داخل کرنی تھی۔ اس نے تجویز کیا کہ یہ توانائی قدیم ترین زمین کے کرہَ ہوائی میں بجلی کی چمک سے حاصل کی گئی ہوگی اور اس مفروضہ پر انحصار کرتے ہوئے اس نے اپنے تجربات میں مصنوعی برقی اخراج سے کام لیا تھا۔

ملر نے ایک ہفتہ تک اس گیسی آمیزہ کو ۱۰۰ ڈگری سیلسیس (حرارت) پر ابالا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے کمرہ میں برقی رو چھوڑ دی تھی۔ ملر نے ایک ہفتہ گزرنے کے بعد تجربہ گاہ کے اندر بننے والے کیمیائی مادہ کا تجزیہ کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ ۲۰، امینو ترشوں لحمیات کے بنیادی عناصر کو تشکیل دینے والے تین امینو ترشے مرکب سازی کر چکے تھے۔''

''اس تجربہ سے ارتقا پسندوں کو بڑا حوصلہ ملا اور اسے ایک نمایاں کامیابی سمجھا گیا۔'' (ایضاً ص ۱۳۳، ۱۳۴)

ملر کا تجربہ باطل اور غیر معتبر تھا:

ملر کے تجربہ کو اب نصف صدی گزر چکی ہے۔ اور اسے بہت سے پہلوؤں سے باطل اور غیر معتبر قرار دیا جا چکا ہے مگر ارتقا پسند ہیں کہ اب بھی اسے ایک ثبوت کے طور پر پیش کر رہے ہیں کہ زندگی بے جان مادہ سے اچانک وجود میں آسکتی تھی۔'' (ایضاً ص ۱۳۴)

ایک میکانکی عمل استعمال کرنے جسے ''سرد پھندا'' کہا گیا ملر نے امینو ترشوں کو متشکل ہوتے ہی ان کے ماحول سے جدا کر دیا تھا۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا ہوتا تو ماحول کے حالات نے سالموں کو نیست و نابود کر دیا ہوتا۔ ملر نے اپنے تجربے میں جس قدیم ارضی ماحول کو پیدا کرنا چاہا وہ حقیقت پر مبنی نہ تھا۔ نائٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو قدیم ارضی کرہَ ہوائی کے عناصر ترکیبی میں شامل ہونا چاہیے تھا مگر ملر نے اسے نظر انداز کر دیا تھا اور اس کی جگہ اس نے میتھین اور ایمونیا استعمال کی تھی۔

ایک اور اہم بات جو ملر کے تجربے کو باطل ٹھہراتی ہے یہ ہے کہ تمام امینو ترشوں کو اس وقت کرہ ہوائی کے اندر تباہ کرنے کے لیے کافی آکسیجن موجود تھی جب یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ وہ متشکل ہو چکے ہیں۔ اس آکسیجن کی موجودگی کو امینو ترشوں (Amino acids) کے متشکل ہونے کی راہ میں مزاحم ہونا چاہیے تھا۔ یہ صورت حال ملر کے اس تجربہ کی مکمل طور پر نفی کرتی ہے جس میں آکسیجن کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اگر اس تجربہ میں آکسیجن استعمال کر لی گئی ہوتی تو میتھن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی میں تحلیل ہو گئی ہوتی اور ایمونیا

نائٹروجن اور پانی میں تحلیل ہو گئی ہوتی۔

دوسری طرف قابل غور بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں اوزون کی تہ ابھی تک موجود نہ تھی اور زمین پر کوئی نامیاتی سالمہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا اس لیے کہ وہ تو شدید بالائے بنفشی شعاعوں سے بالکل غیر محفوظ تھی۔ (ایضاً ص ۱۳۵،۱۳۶)

چند امینوترشوں کے علاوہ جو زندگی کے لیے لازمی ہیں۔ ملر کے تجربہ نے بہت سے نامیاتی ترشے پیدا کئے تھے جن میں ایسی خاصیتیں موجود تھیں جو جانداروں کی ساخت اور کام کے لیے بہت ضرر رساں اور مہلک ہوتی ہیں۔ اگر امینوترشوں کو الگ نہ کر لیا گیا ہوتا اور انہیں اسی ماحول میں اس کیمیائی مادہ کے ساتھ نہ چھوڑا گیا ہوتا تو کیمیائی ردعمل کی وجہ سے ان کی تباہی اور مختلف آمیزشوں میں ان کی منتقلی ناگزیر تھی۔ مزید یہ کہ دائیں ہاتھ والے امینوترشے زیادہ تعداد میں متشکل ہو گیے تھے۔ صرف ان امینوترشوں کی موجودگی ہی کافی تھی جو اس نظریے کو اس کے تمام استدلال کے باوجود مسترد کرتی تھی اس لیے کہ دائیں ہاتھ والے امینوترشے ان امینوں ترشوں میں سے تھے جو جاندار نامیاتی اجسام کی تالیف میں کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور جو لحمیات کو اس وقت بے کار ٹھہرا دیتے ہیں جب وہ ان کی تالیف میں مصروف ہوتے ہیں۔

اس ساری گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ ملر کے تجربہ میں جن حالات میں امینو ترشے (Amino acids) متشکل ہوئے تھے وہ زندگی کے لیے موزوں نہ تھے۔

(ایضاً ص ۱۳۵،۱۳۶)

ایک طویل خاموشی کے بعد ملر نے خود بھی اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ اس نے تجربہ میں جو کرہ ہوائی سے متعلق ماحول استعمال کیا تھا وہ حقیقت پر مبنی نہیں تھا۔ (ص ۱۳۵)

ارتقاء پسند اس تجربہ کو سامنے لا کر خود ہی نظریہ ارتقاء کو مسترد کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ تجربہ کچھ ثابت بھی کرتا ہے تو وہ اس قدر ہے کہ امینوترشے (Amino acids) صرف ایک زیر کنٹرول تجربہ گاہ کے ماحول میں پیدا کئے جا سکتے ہیں، جہاں ایک مخصوص قسم کے حالات خاص طور پر شعوری مداخلت سے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔

گویا یہ تجربہ ظاہر کرتا ہے کہ جو کچھ (یہاں تک کہ امینوترشے کی مختصر زندگی (Near life) بھی زندگی کو وجود میں لاتا ہے وہ غیر شعوری اتفاق نہیں ہو سکتا۔ بل کہ کسی کی ایک شعوری مرضی سے ایسا ہوتا ہے جسے ایک لفظ میں تخلیق کہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کا ہر

مرحلہ زندگی کے وجود اور اللہ کے جلیل القدر ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

(ایضاً ص ۱۳۶، ۱۳۷)

ڈی۔این۔اے (D.N.A.) حیرت انگیز سالمہ:

"۱۹۵۵ء میں ڈی۔این اے پر دو سائنسدانوں جیمز واٹسن اور فرانسس کرک کے کام نے حیاتیات میں ایک نئے عہد کا آغاز کیا تھا"۔(ص ۱۳۷)

"وہ سالمہ جسے ڈی۔این۔اے کہتے ہیں اور جو ہمارے جسم کے ۱۰۰ ٹریلین خلیوں میں سے ہر ایک میں پایا جاتا ہے، اس میں مکمل انسانی جسم کی تعمیر کا منصوبہ ہوتا ہے۔ایک خاص کوڈ پر مشتمل نظام کے ذریعہ کسی انسان کی تمام صفات سے متعلق معلومات، جسمانی خدوخال سے لے کر داخلی اجزاء کی ساخت تک ریکارڈ کر لی جاتی ہیں۔ڈی۔این۔اے۔میں موجود وہ معلومات چار خاص بنیادوں کی ترتیب کے اندر رمزی صورت میں (Coded) ریکارڈ کر لی جاتی ہے۔جو اس سالمے کو وجود بخشتی ہے۔ان بنیادوں کو اے۔ٹی۔جی۔اور سی۔ان کے ناموں کے ابتدائی حروف کے لحاظ سے پکارا جاتا ہے۔ان حروف کی ترتیب میں جو فرق ہوتا ہے وہی فرق لوگوں کی جسمانی ساخت میں ہوتا ہے۔"ایک اندازے کے مطابق۔۔۔ ایک ڈی۔این۔اے میں ۳٫۵ بلین حروف ہوتے ہیں۔(ص ۱۳۷)

(رمزی کوڈ اے، ٹی، جی، سی حروف کے مترادف کے طور پر نیوکلیوٹائڈ (Nucleotide) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔تو اس طرح ایک ڈی۔این۔اے۔سالمے میں ۳٫۵ بلین حروف ہوتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۳٫۵ بلین نیوکلیوٹائڈ (Nucleotide) پائے جاتے ہیں۔ف)

ڈی۔این۔اے۔کا ایک خاص عضو یا لحمیہ ان خصوصی عناصر ترکیبی میں شامل ہوتا ہے جن کو جین (Jene) کہا جاتا ہے۔مثال کے طور پر آنکھ سے متعلق معلومات خصوصی جینز کے ایک پورے سلسلہ میں پائی جاتی ہیں جبکہ قلب سے متعلق معلومات ایک دوسرے جینز کے سلسلہ میں پائی جاتی ہیں۔خلیہ میں لحمیہ کی پیداوار ان جینز میں شامل معلومات کو استعمال کر کے حاصل کی جاتی ہے۔وہ امینو ترشے جو ایک لحمیے کی ساخت کو ترتیب دیتے ہیں انہیں ڈی۔این۔اے۔میں موجود نیوکلیوٹائڈ (Nucleotides) کی ترتیب و تنظیم سے واضح کیا جاتا ہے۔(ایضاً ص ۱۳۸)

اگر ان نیوکلیوٹائڈز کی ترتیب میں غلطی سرزد ہو جائے جو ایک جین بناتے ہیں تو اس سے جین مکمل طور پر بیکار ہو جائے گا۔ جب یہ تصور کر لیا جائے کہ انسانی جسم میں ۲۰۰ ہزار جین ہیں، تو یہ بات اور زیادہ عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کئی ملین نیوکلیوٹائڈ کے لیے کس قدر ناممکن ہو جاتا ہے، جو یہ جین بناتے ہیں کہ وہ صحیح ترتیب میں اتفاقاً متشکل ہو جائیں۔ (ص ۱۳۸)

ایک ارتقاء پسند ماہر حیاتیات فرنک سیلسبری (Frank Salisbury) اس ناممکنہ بات پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

"ایک درمیانے لحمیے میں ۳۰۰، امینو ترشے شامل ہو سکتے ہیں۔ ایک جین جو اسے کنٹرول کر رہا ہو، اس کی زنجیر میں تقریباً ۱۰۰۰ نیوکلیوٹائڈز ہو سکتے ہیں۔ ایک ڈی۔ این۔ اے۔ زنجیر میں چوں کہ چار قسم کے نیوکلیوٹائڈز ہوتے ہیں جن میں سے ایک میں ۱۰۰۰ ر کڑیاں ہو سکتی ہیں جو ۴ر کے اوپر ۱۰۰۰ ر پاور کی شکل میں ہو سکتا ہے۔۔۔ یعنی اگر ۱۰ ر کو ۸۰ ر سے ۶۰۰ ر مرتبہ ضرب دی جائے تو جو ہندسہ حاصل ہو گا وہ ہے ا جس کے بعد ۶۰۰ صفر آئیں گے۔ یہ تعداد ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔۔" (ص ۱۳۸، ۱۳۹)

"دراصل ایک لحمیے اور ایک نیوکلائی ترشے (D.N.A., R.N.A.) کا اللطپ متشکل ہو جانا بعید از امکان نظر آتا ہے اور بہت کم ادراک میں آسکتا ہے۔۔"

(Prof. Ali Demirsoy۔ ایک ارتقاء پسند محقق)

مزید یہ کہ ڈی۔ این۔ اے۔ کچھ خامروں کی مدد سے نقش ثانی بنا سکتے ہیں جو واقعی لحمیے ہوں اور ان خامروں کی ترکیب و تالیف صرف ڈی۔ این۔ اے۔ بذریعہ کوڈ شامل شدہ معلومات سے ہو سکتی ہے۔ یہ دونوں چوں کہ ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں اس لیے یا تو انہیں بیک وقت نقش ثانی بنانے ہوتے ہیں یا ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے قبل تخلیق کیا جانا ہوتا ہے۔" (ص ۱۳۹)

"ایک امریکی ماہر خورد حیاتیات جیکب سن اس موضوع پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

منصوبوں کی تخلیق مکرر کے لیے مکمل ہدایات، توانائی اور دستیاب ماحول میں کچھ حصوں کو علیحدہ کرنے، نشو و نما اور بالیدگی، ترتیب اور موثر میکانکی عمل کے کہ وہ ہدایات کو اس سمت میں منتقل کر سکیں جہاں سب کی بالیدگی کا سوال ہو، ان سب کو ساتھ ایک وقت میں اس لمحہ موجود ہونا چاہیے (جس لمحہ کہ زندگی کی ابتدا ہوئی)۔

واقعات کا یوں یکجا ہو جانا قابل یقین حد تک اتفاقیہ (غیر شعوری اتفاق نہیں بل کہ شعوری مرضی و مداخلت ۔ف) نظر آتا ہے اور اسے اکثر غیبی مداخلت کا نام دیا جاتا ہے۔
(ایضاً ص ۱۳۹)

"۔۔۔۔بات کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ ڈی۔این۔اے۔کے لیے تخلیق مکرر کی ضرورت، اس کے لیے کچھ لحمیات کی موجودگی کی ضرورت اور ڈی۔این۔اے۔میں موجود معلومات کے مطابق ان لحمیات کی تخلیق مکرر ارتقا پسندوں کے نظریے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔" (ص ۱۴۰)

امینو یرشے ناقابل یقین حد تک پیچیدہ ساخت کے حامل لحمیات، دائیں ہاتھ والے، بائیں ہاتھ والے خدوخال اور پیپٹائیڈ ملاپ اور جانداروں کے خلیے بنانے والے لحمیات کو کسی قدیم کرۂ ہوائی میں پیدا کرنا، تشکیل دینا مستقبل کے کسی بھی تجربہ مین ممکن نہ ہوگا۔

"اگر ہم ایک لمحے کے لیے یہ بھی فرض کرلیں کہ لحمیات کسی طرح اتفاقاً وجود میں آجاتے ہیں اس کا بھی کچھ مطلب نہ ہوگا کیوں کہ لحمیات اپنے طور پر کچھ بھی نہیں ہوتے: وہ ازخود تخلیق مکرر نہیں کرسکتے۔لحمیات کی ترکیب وتالیف تو صرف اس معلومات سے ہوتی ہے جو ڈی۔این اے۔او آر۔این اے (D.N.A,R.N.A.) سالموں میں بغیر کوڈ پہنچائی جاتی ہے۔(اور) یہ ناممکن ہے کہ ڈی۔این۔اے اور آر۔این۔اے کے بغیر ایک لحمیہ تخلیق مکرر کرسکے"۔ (ص ۱۴۰)

"(اور) ڈی۔این اے۔اور آر۔این۔اے۔کے لیے ناممکن ہے کہ وہ اتفاقاً متشکل ہو گیے ہوں۔(ص ۱۴۱)۔۔۔۔جیسا کہ سالموں کا تحقیقی مطالعہ کرنے والے تمام سائنسدانوں کی طرف سے واضح طور پر واشگاف کیا جاچکا ہے۔

"ہر شعبہ میں نظریہ ارتقاء کی موت کے ساتھ آج شعبہ خورد حیاتیات میں کئی ایسے مشہور نام ہیں جو تخلیق کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور انہوں نے اس تصور کا دفاع شروع کر دیا ہے کہ ہر شے ایک خالق کی مرضی ومنشا سے ایک اعلیٰ وارفع تخلیق کے حصہ کے طور پر تخلیق کی گئی ہے"۔ (ص ۱۴۱)

(۳)

سائنس اور اسلام

(حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مفتی محمد تقی عثمانی کے افادات کی روشنی میں)

از حکیم فخر الاسلام

الحمدلله رب العالمين و الصلوٰة و السلام علیٰ رسوله النبی الأمين •

"او لم يروا كيف يبدء الخلق ثم يعيده ان ذالک علی الله يسير"

(پارہ ۲۰ رکوع ۱۴)

کیا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالی کس طرح مخلوق کو اول بار پیدا کرتا ہے، پھر وہی دوبارہ اس کو پیدا کرے گا، اور یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی آسان ہے۔

"كل شيء هالک الا وجهه له الحكم واليه ترجعون"

(پارہ ۲۰ رکوع ۱۲)

ہر چیز اپنی ذات سے معدوم ہے اور تمام چیزوں کو فنا ہونا ہے، سوائے خدائے تعالیٰ کے کہ وہ نہ کبھی معدوم تھا، نہ کبھی فنا ہو سکتا ہے۔ اسی کی حکومت ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

توحید، اسلام کا اساس اعظم (سب سے اہم بنیاد) ہے۔ اللہ تعالی خالق کائنات ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، سب چیزیں اس کی محتاج ہیں اور اسی کے پیدا کرنے سے وجود میں آئی ہیں۔

یہ اصل اور صحیح عقیدہ ہے۔ لیکن اہل سائنس نے اس کے برخلاف مادہ کے متعلق یہ عقیدہ اور نظریہ قائم کیا کہ وہ قدیم ہے، اور بغیر کسی کے پیدا کئے ہمیشہ سے موجود ہے۔ اس کے لیے ان سائنس دانوں کے پاس جو دلیل ہے وہ یہ کہ یہ ساری کائنات اور اس کی تمام چیزیں اگر معدوم اور غیر موجود تھیں تو عدم محض (یعنی بالکل کسی بھی شکل میں موجود نہ ہونے)

سے پھر وجود میں آجانا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے ہی ان کا یہ نظریہ قائم ہو گیا کہ مادہ قدیم ہے۔ یعنی ہمیشہ سے موجود ہے اور اسی سے خود بخود دنیا کی ساری چیزیں بنتی چلی گئیں۔ (الانتباہات المفیدہ ملخصاً از حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ)

(نوٹ جو چیز ہمیشہ سے ہو اسے قدیم کہتے ہیں۔ اور جس چیز پر پہلے فنا طاری رہا ہو اس کے بعد وہ موجود ہوئی ہو یعنی عدم سے وجود میں آئے اسے حادث کہتے ہیں۔ ف)

مادہ کے قدیم ہونے کا عقیدہ ظاہر ہے کہ اسلام کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اگر صحیح طور پر غور کیا جائے تو مادہ کو قدیم ماننے کے بعد خود خالق کائنات کو ہی ماننے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اس لیے کہ جب مادہ بذات خود ہمیشہ سے موجود ہے اور کسی خالق و باری کے پیدا کرنے کا محتاج نہیں، تو مادہ خود واجب الوجود ہو گیا۔ یعنی اپنے موجود ہونے کی خود ہی علت (Efficient cause) بن گیا۔

(نوٹ: واجب الوجود اسے کہتے ہیں جو اپنے پائے جانے اور موجود ہونے میں کسی کے پیدا کرنے کا محتاج نہ ہو، اور اس کی ذات خود ہی اس کے وجود کی حقیقی علت (Efficient cause) ہو۔ ف)

ایسی صورت میں مادہ کا تعلق اپنی صفات حرکت اور مختلف قسم کے افعال کے ساتھ واجب الوجود کا سا ہو گیا۔ (الانتباہات المفیدہ ملخصاً: ص ۱۰۲ تا ۱۲۹) —— حالاں کہ واجب الوجود ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اللہ واجب الوجود ہے اور باقی تمام چیزیں ممکن الوجود ہیں۔ اللہ باقی ہے اور تمام چیزیں فانی ہیں۔

تو مومن و مسلم جو خدا تعالیٰ کو واجب الوجود مانتا ہے اور ہر شے کو اس کا محتاج سمجھتا ہے، وہ لامحالہ مادہ کو بھی حادث اور فانی ہی سمجھے گا، کہ پہلے نہیں تھا پھر اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے موجود ہوا۔ اور مادہ سے چیزوں کے بننے اور ساختوں کے ترتیب پانے میں بھی اصل فاعل اور مؤثر اللہ کی ذات ہے۔ اسی کے قول "کن" کی ہر چیز محتاج ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ مادہ اپنے موجود ہونے اور اپنے ذریعہ افعال و تاثیرات کے صادر ہونے میں کسی خالق و مختار کا محتاج ٹھہرا تو نہ وہ واجب الوجود ہو سکتا ہے اور نہ قدیم۔

یہی وہ بنیادی عقیدہ اور مرکزی نقطہ ہے جس کی طرف توجہ نہ دینے کی وجہ سے شدید گمراہی پھیلی اور جس نے اہل سائنس کو صحیح راستہ سے ہٹا دیا۔

مادہ کو قدیم ماننے کی وجہ سے ایک سنگین غلطی تو یہ صادر ہوئی کہ خدائے تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت ابدالآباد سے موجود ہونے اور قدیم ہونے کو ایک دوسری شے یعنی مادہ کے لیے ثابت کیا گیا۔ (الاعتبارات المفیدہ، ص ۱۲۸ ملخصا)

سائنس دانوں سے دوسری سنگین غلطی یہ صادر ہوئی کہ چونکہ اہل سائنس نے ایک ضابطہ قرار دے لیا ہے کہ کوئی کام خلاف فطرت واقع نہیں ہوسکتا۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ آگ ہمیشہ جلاتی ہے، کبھی اس کے خلاف نہیں دیکھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ ماں باپ سے پیدا ہوتا ہے، کبھی اس کے خلاف نہیں دیکھا۔ لہٰذا یہی فطری قاعدہ ہے اور جو اس فطری قاعدہ کے خلاف ہوگا، وہ محال اور ناممکن ہے۔

جب یہ بات ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا اثر نہ کرنا، عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور آدم علیہ السلام کا پہلے انسان کی شکل میں اللہ کی قدرت سے وجود میں آنا، یہ سب چیزیں قانون طبیعی سے ہٹی ہوئی ہونے اور خلاف فطرت ہونے، نیز اہل سائنس کی سمجھ سے بالاتر ہونے کی وجہ سے سائنس دانوں نے ان تمام واقعات کا اور نبیوں کے معجزات کا انکار کیا۔ مادہ پرست سائنس دانوں کے اتباع اور تقلید میں ہی بعض مسلمانوں نے بھی قرآن و حدیث میں جو معجزات مذکور ہوئے ہیں، ان کے معانی کی تفہیم و تعبیر میں تاویل باطل سے کام لیا۔ حتی کہ قرآن کریم میں ہدہد پرندے کی حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ گفتگو کی تشریح میں اور ابابیل پرندوں کے ذریعہ اصحاب فیل کی ہلاکت کے واقعہ میں معذرت خواہانہ تاویل پیش کی۔ جب معجزات کے ساتھ یہ معاملہ کیا تو کرامات اولیاء تو پھر کسی شمار میں نہیں۔

اہل سائنس کا یہ خیال ہے کہ ہر چیز میں ایک تاثیر ہے جس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ (یعنی اس تاثیر کا اثر ضرور ہوگا) اور کسی شئ میں تاثیر رکھ دینے کے بعد نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کو بھی قدرت نہیں رہی کہ اس کے خلاف ہوسکے۔ مثلاً آگ کے اندر جلانے کی تاثیر رکھ دی گئی ہے، اب یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آگ نہ جلائے۔ اس خیال باطل سے فکر و عقیدہ میں یہ خرابی پیدا ہوئی کہ اللہ کی وسیع اور غیر محدود قدرت کو تاثیرات اور طبیعات کے دائرے میں محدود کر کے رکھ دیا گیا۔ حالاں کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس طرح اشیاء میں تاثیرات رکھنے پر اسے قدرت ہے، ویسے ہی کسی شے سے تاثیر اٹھا لینے پر بھی وہ قادر ہے۔ ”وھو علیٰ کل شئ قدیر“۔

کوئی واقعہ خلاف عادت پیش آئے مثلاً پتھر پر لاٹھی مارنے سے پانی نکل آئے یا آگ کے جلانے کا اثر کسی خاص شخص پر ظاہر نہ ہو۔ اس طرح کے خلاف عادت واقعات کو ''خوارق'' کہتے ہیں۔ جب یہ خوارق انبیاء کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے ہیں تو انہیں معجزہ کہتے ہیں۔ اور یہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہوتی ہیں جو بلا اسباب طبیعہ کے بھی ظاہر ہو جایا کرتی ہیں۔ اور معجزہ کہتے ہی ہیں ان واقعات کو جو بلا اسباب طبیعہ کے ظاہر ہوں اور جن کے ادراک سے عقلیں حیران رہ جائیں لیکن اہل سائنس ایسے تمام واقعات کا جو بلا اسباب طبیعہ ظاہر ہوں، انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا معجزات کا بھی انکار کرتے ہیں۔

معجزات کے سلسلہ میں نظیر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مگر سائنس دانوں کی یہ شدید غلطی ہے۔ کیوں کہ معجزاتی واقعہ کی اگر کوئی نظیر ہو تو وہ بھی تو ایک واقعہ ہوگا، پھر اس کی بھی اہل سائنس نظیر کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ اس طرح سلسلہ لامتناہی (Infinity) تک چلا جائے گا۔ اور یہ محال ہے۔ (حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ملفوظات حکیم الامت ملخصاً جلد ۲۹ ص ۱۷۴)

اصل بات یہ ہے کہ ایک خالق کائنات کے وجود اور اس کی قدرت کاملہ کو تسلیم کرنے سے یہ سائنس داں گریز کر رہے ہیں۔ اور مادہ اور زمانہ کو ہی خدا ماننے پر ان کا اصرار برابر جاری ہے۔ لیکن اس میں بھی ایک اقرار پوشیدہ ہے۔ یہاں پر حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کا ایک اہم ملفوظ نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''فرمایا کہ ہر شخص خدا کا قائل ہے چاہے وہ اپنے قصد سے انکار ہی کرے۔ کیوں کہ کسی نہ کسی کو فاعل حقیقی مانے ہی گا۔ اور فاعل حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ اس طرح سے بلا قصد اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے، مگر غیر فاعل کو فاعل سمجھ گیا۔ (یہ اس کی خطا ہے۔ ف) حدیث ''لا تسبوا الدھر فان اللہ ھو الدھر'' میں اسی طرف اشارہ ہے۔ (ملفوظات حکیم الامت: جلد ۲۶ ص ۵۷) ۔۔۔ یعنی زمانہ کو برا مت کہو۔ اللہ ہی زمانہ ہے۔ مطلب یہ کہ زمانہ کی باگ ڈور اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی فاعل حقیقی ہے۔ اہل سائنس کے مادہ کو اصل فاعل اور موثر کہنے سے مادہ فاعل حقیقی اور قادر مطلق نہیں ہوگیا۔ کائنات کی یہ منظم ترتیب و تخلیق ایک خالق و مالک کے اختیار و ارادہ سے ہی قائم ہے۔

کائنات کا یہ حیرت انگیز نظام اندھی بہری طبعی اور کیمیائی طاقتوں (Blind Interplay of physical and chemical forces) پر مبنی نہیں

ہے۔ چناں چہ ''آج شعبہ خورد حیاتیات میں کئی ایسے مشہور نام ہیں جو تخلیق کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور انہوں نے اس تصور کا دفاع شروع کر دیا ہے کہ ہر شئے ایک خالق کی مرضی اور منشا سے ایک اعلیٰ وارفع تخلیق کے حصہ کے طور پر تخلیق کی گئی ہے۔''

(اللہ کی نشانیاں ص ۱۱۴۔ از ڈاکٹر ہارون یحیٰ)

ع بولے کہ اس خدا پہ جو آتا نہیں نظر ہے عقل سے بعید کہ ایمان لائیے
میں نے کہا بجا ہے یہ فرمان آپ کا لیکن ذرا وہ عقل تو ہم کو دکھائیے

(مجالس ابرار، ص ۳۸۵ جمع فرمودہ۔ از حکیم محمد اختر صاحب)

یہ تو تھا مادہ کے سلسلہ میں سائنس دانوں کی غلطی وفریب خوردگی کا ایک اجمالی تذکرہ۔ لیکن جہاں تک خود سائنس کا تعلق ہے تو سائنس حالیہ دنوں میں جن چیزوں کا انکشاف کرتی چلی جارہی ہے، اس کے بعد اب قرآنی حقائق پر اور خالق کائنات کی قدرت کاملہ پر ایمان کے نئے نئے دروازے کھلتے جارہے ہیں، اور جدید سائنسی ترقی جیسے جیسے غور و فکر کے نئے وسائل مہیا کرتی جارہی ہے، قرآن کریم کے معجزہ ہونے کے نئے نئے دلائل بھی فراہم ہوتے جارہے ہیں۔ قرآن کریم نے اس کی خبر پیشگی ہی دے رکھی ہے۔ **سنریھم آیاتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق۔** (حم السجدہ:۵۳) ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے کائنات میں بھی اور خود ان کی اپنی جانوں میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ کلام حق ہے۔

سائنسی مطالعہ اور تحقیق کے باب میں اسلامی نقطہ نظر:

تحقیقات، اختبارات اور انکشافات کے ذریعہ کائنات کی پوشیدہ قوتوں تک رسائی حاصل کرنا، اگر صحیح نیت سے ہو تو اسلام کی نظر میں محمود اور مطلوب ہے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور سیکولر انگریزی تعلیم کے متعلق جو حکم صراحت کے ساتھ مجدد ملت حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے لگایا ہے، وہی اس پر بھی منطبق ہوتا ہے فرماتے ہیں کہ:

''عقائد بھی خراب نہ ہوں جس کا آسان طریقہ بل کہ متعین طریقہ یہی ہے کہ علم دین حاصل کر کے یقین کے ساتھ اس کا اعتقاد رکھے اور اعمال بھی خراب نہ ہوں۔ عزم بھی یہ رہے کہ اس سے وہی معاش حاصل کریں (گے) جو شرعاً جائز ہوگی (کیوں کہ عموماً آجکل ان علوم میں ترقی معاش حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے)۔۔ تو انگریزی مباح اور درست

ہے اور اگر اس سے بڑھ کر یہ قصد ہو کہ اس کو ذریعہ خدمت دین بناویں گے تو اس کے لیے عبادت ہوگی۔ (امداد الفتاوی جلد ششم ص ۱۵۶،۱۵۷)

یہاں پر ہم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کے حوالہ سے لیکن کسی قدر تلخیص و اختصار کے ساتھ چند ملفوظات پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ اسی نیت کی تبدیلی سے مغربی محققین اور مادہ پرست سائنسدانوں سے ایک مسلمان سائنسداں کا طرز فکر کس طرح مختلف ہو جاتا ہے، اور مومن کے لیے یہ تحقیقات عبادت کس طرح بن جاتی ہیں وہ قابل لحاظ امور درج ذیل ہیں:

(۱) مغرب کی تنگ نظری مادہ کے اس پار کچھ دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہے، لہٰذا مادہ پرست سائنسداں اپنی تحقیق و دریافت کو محض اپنی قوت بازو، اپنی عقل و فکر اور اپنی محنت و کاوش کا ثمرہ سمجھتا ہے، اسے ان تمام انکشافات کے پیچھے کسی خالق و مالک کا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ لیکن ایک مسلمان سائنسدان کی نظر اس محنت و جستجو اور ان تجربات اور انکشافات پر جا کر نہیں رکتی۔ بل کہ وہ ان سب کے آگے اس خالق و مالک کی قدرت کاملہ کا نظارہ کرتا ہے جس نے ایک طرف پوری کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے اور دوسری طرف انسان کو وہ عقل و فکر اور وہ طاقت و توانائی بخشی ہے جس کے ذریعہ اس نے کائنات کی عظیم طاقتوں کو رام کر لیا ہے۔ "**الم تروا ان الله سخر لكم ما فى السمٰوات و ما فى الارض و اَسبغ عليكم نعمه ظاهره و باطنه**" (لقمان:۲۰)۔۔۔کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور تم پر اپنی تمام نعمتیں پوری کر دی ہیں۔ کھلی ہوئی نعمتیں بھی اور پوشیدہ نعمتیں بھی۔

چناں چہ ایک مسلمان تحقیق و انکشاف میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد کسی پندار یا گھمنڈ میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے خالق و مالک کے حضور سر نیاز خم کر دیتا ہے، اور پکار اٹھتا ہے: "**سبحٰن الذى سخر لنا هٰذا و ما كنا له مقرنين و انا الى ربنا لمنقلبون**"۔ (الزخرف:۱۳)۔۔۔پاک ہے وہ ذات جس نے اس چیز کو ہمارے لیے مسخر کر دیا، اور ہم بذات خود ایسے نہ تھے کہ اس کو قابو کر لیتے اور ہم کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

(۲) انکشافات و ایجادات کو استعمال کرنے کا طریقہ مغربی ذہن اور مادہ پرست

سائنسداں خود اپنی عقل سے متعین کرتا ہے، لیکن اسلام کی تعلیم کی روشنی میں ایک مسلمان کا یہ طرز فکر ہوتا ہے کہ جس خدا نے تحقیقات وایجادات کی قوت وصلاحیت عطا کی ہے، وہی اس کے استعمال کا صحیح طریقہ بھی بتا سکتا ہے، لہٰذا ایجادات وانکشافات کو اسی طرح اور انہیں کاموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے۔ کیوں کہ جب انسان وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر ان ایجادات کو استعمال کرنے کا طریقہ خود متعین کرتا ہے تو اس سے کائنات کی یہ بہترین نعمتیں انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے اسے بعض اوقات ہلاکت اور تباہی کے راستے پر ڈال دیتی ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چاند اور مریخ پر جھنڈے گاڑ دینے کے باوجود اس کی اپنی زندگی تاریک سے تاریک تر ہوتی چلی جاتی ہے، اور نفع وضرر کا فیصلہ کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع وضرر کر نہ سکا

(۳) مغرب کی مادہ پرست ذہنیت، تحقیقات، انکشافات اور تسخیر کائنات کو بذات خود منزل مقصود سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی زندگی کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں کہ وہ کائنات کی نفع بخش چیزوں سے زیادہ سے زیادہ لذت اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر دنیا سے رخصت ہو جائے۔ اس کے برخلاف ایک مسلمان کی نظر میں تحقیقات انکشافات، ایجادات اور تسخیر کائنات بذات خود کوئی مقصد نہیں بل کہ مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ اور انسان کے راستہ کی محض ایک منزل ہے۔ اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کو اس پوری کائنات سے خدمت لینے کا حق اسی وقت ہے جب وہ خود اپنے مقصد تخلیق اور فریضہ منصبی کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے۔ اور وہ مقصد اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ''۔۔۔ میں نے جنات اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔ (اسلام اور جدت پسندی، باب اسلام اور تسخیر کائنات ص ۸۴ تا ۸۷)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

برصغیر ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں آج اسلامی روایات، مذہبی جذبات اور ملی شعار کے وجود کا جو احساس ہوتا ہے، وہ انہیں ''دینی مدارس'' اور ''صفہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نظام تعلیم کی مرہونِ منت ہے اور اسلاف کی دوراندیش عقل اور باریک بین نگاہ کا صدقہ ہے۔

(۴)

''سائنس اور اسلام''

(باہمی نسبت۔ذریعہ اور مقصود کا فرق)

از افادات حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ

از حکیم فخر الاسلام الہ آبادی

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ و السلام علیٰ رسولہ النبی الأمین •

''سائنس اور اسلام'' کے موضوع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے ۱۳۵۷ھ (مطابق ۱۹۳۸ء) میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تقریر کی تھی۔اس تقریر میں حضرت قاری صاحبؒ نے سائنس اور اسلام کی حقیقت،غرض وغایت،دونوں کی جبلت وصفات،نیز آثار وثمرہ اور دونوں کے مابین نسبت کی تعیین فرمائی ہے اور مقصود اور وسیلہ کی تحقیق بیان کرتے ہوئے خلاصہ کلام کے طور پر فرمایا ہے کہ: اسلام مقصود ہے اور سائنس اس کا وسیلہ اور ظاہر ہے کہ ترقی ہمیشہ مقاصد میں کی جاتی ہے نہ کہ ذرائع اور وسائل میں۔یعنی سائنس کے معمولات اسی حد تک اختیار کیے جائیں جس حد تک اسلام کو ان کی ضرورت ہے۔(ص ۸۱)۔۔۔سائنس مذہب سے بے تعلق رہ کر کلمہ خبیثہ ہے جس کے لیے کوئی ثبات و قرار نہیں اور مذہب کے ساتھ بحیثیت ایک خادم اور ذریعہ مطلوب کے وابستہ ہو کر وہ بلاشبہ نافع اور کارآمد ہوگی اور کلمہ طیبہ ہی کے ذیل میں آجائے گی جس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔(ص ۹۱)۔۔۔یہاں تسہیل واختصار کے ساتھ اصل مضمون ملاحظہ ہو۔

سائنس کا اصل موضوع چوں کہ موالید ثلاثہ یعنی جمادات،نباتات اور حیوانات ہیں جن کی ترکیب عناصر اربعہ سے ہوئی ہے۔اور سائنس کا دائرہ کار انہیں عناصر اربعہ کی خاصیات اور آثار کا عملاً سمجھنا اور پھر کیمیاوی طریق پر ان کی تحلیل وترکیب کے تجربات سے عملاً نئی نئی اشیاء کو پردہ ظہور میں لاتے رہنا سائنس کا مخصوص دائرہ علم وعمل ہے۔پھر ان عناصر کی جوہری

قوت کا معیار کیا ہے؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت قاری صاحب فرماتے ہیں کہ جس عنصر میں جتنی لطافت ہے اس میں اتنی ہی زیادہ غلبہ، تسلط اور اقتدار کی شان ہے۔ اور جس قدر جس میں کثافت (Density) کی زیادتی ہے اسی قدر اس میں مغلوبیت، ذلت اور پستی نمایاں ہے۔ اور لطافت چوں کہ ایک وصف کمال ہے اور ہر وجودی کمال کا مخزن حضرت واجب الوجود (اللہ تعالیٰ) کی ذات بابرکات ہے، اس لیے لطافتوں کا منبع بھی وہی ہے۔ اور جس چیز میں بھی لطافت کا کوئی کرشمہ ہے وہ درحقیقت اسی ذات وصفات کا پرتو ہے۔ لہذا جس شئ میں جتنی زیادہ لطافت ہے حق تعالیٰ سے اس کو اسی قدر زیادہ مناسبت ہوگی۔ اور وہ اسی قدر زیادہ صفات کمال کا مرکز ومحور بنتی چلی جائے گی اور اس میں استیلاء، استغناء، قوت اور غلبہ کی شان پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ (ص ۹ تا ۱۲)

عنصر ارض (زمین، مٹی) میں چوں کہ سب سے زیادہ کثافت ہے، اس کا مادہ بھی کثیف، صورت بھی کثیف اور طبیعت بھی کثیف تو ذات اقدس سے اس وصف میں اسے بعد مطلق (بے انتہاء دوری) حاصل ہے لہٰذا ضعف مطلق (بے انتہاء کم زوری) اور ذلت مطلقہ (نہایت درجہ ذلت) بھی اسی عنصر کے حصہ میں آئی۔ اسی مٹی کی جنس سے پہاڑ اور پتھر ہیں، جن میں لطافت (Rarer ہونے کی صلاحیت) زیادہ ہے تو ان کی قوت بھی زیادہ ہے، لوہے کے اندر لطافت اور بھی زیادہ ہے تو اس کی قوت بھی زیادہ شدید ہے۔ چناں چہ ایک بالشت بھر کدال وزنی وزنی پتھروں کو چکنا چور کر دیتی ہے۔ لیکن یہی طاقتور لوہا جب آگ کے سامنے آتا ہے تو بالکل بے بس۔ کیوں کہ آگ اس سے زیادہ لطیف ہے۔ آگ کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس میں سے خود شعاعیں پھوٹتی ہیں، تاریک چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ لیکن پانی کے مقابلہ میں آگ بھی مغلوب۔ کیوں کہ آگ کسی شئ کو اپنے اندر رکھ پا تو سکتی تھی لیکن وہ اتنی لطیف نہیں تھی کہ کسی شئ کا عکس قبول کر سکے لیکن پانی عکس اور اصل دونوں کو اپنے اندر رکھ پا لیتا ہے، وہ لطیف المادہ ہونے کے ساتھ لطیف الصورت بھی ہے حتیٰ کہ نگاہ تک بھی اس سے آر پار ہو جاتی ہے۔ اپنی لطافت اور قوت کی وجہ سے وہ آگ پر غالب ہو جاتا ہے۔ مگر یہی پانی جو آگ کو تہس نہس کر دیتا ہے، ہوا کے سامنے بالکل بے بس اور عاجز۔ چلتی ہوئی ہوا میں یہ سکون سے رہنا چاہے تو رہ نہیں سکتا۔ ہوا کے جھکڑ جب چلتے ہیں تو تالاب اور جھیلیں ہی نہیں بڑے بڑے سمندر تہہ وبالا ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ہوا پانی

سے زیادہ لطیف ہے۔ اس کی لطافت کا یہ حال ہے کہ نگاہ جیسی لطیف شئ بھی اس پر جم نہیں سکتی اسے دیکھ نہیں سکتی۔ (ص ۱۲ تا ۲۰)

اس کے بعد جب ہم انسان کی قوت کا اندازہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ انسان ان تمام عناصر اور ان کے موالید پر غالب ہے، عناصر کی تمام قوتیں انسان کے ہی قبضہ تصرف میں ہیں۔

زمین میں کوئیں بنانا، تہ خانے تیار کرنا، معدنیات کے خزانے حاصل کرنا، پہاڑوں کو تراش کر مکانات بنانا، راستے نکالنا ''و تنحتون الجبال بیوتا'' زمین کے خزائن و دفائن کے راز فاش کرکے اثقال زمین کو عالم آشکارا کر دینا۔

آگ جیسا خونخوار عنصر، جب یہ لوہے اور پتھر میں جا کر چھپتی ہے تو انسان لوہے اور پتھر کو ٹکرا کر آگ کی مخفی چنگاریاں کھینچ لیتا ہے۔ وہ آفتاب میں جا کر چھپتی ہے انسان آتشی شیشوں کے ذریعہ اسے گرفتار کر لیتا ہے اور پھر جب خود اسے چھپانے اور قید کرنے پر آیا تو ذرا سی دیا سلائی کے سرے پر رتی برابر مسالہ میں قید کر دیا کہ جب چاہا دیا سلائی کا سرا رگڑا اور اس قیدی کو نکال باہر کیا۔ گویا وہ آگ جو سر نیچا نہ کرتی تھی اس کی رفعت و تعلیٰ سب خاک میں مل گئی۔ کہیں چولہوں میں انسان کی خدمت کر رہی ہے کہیں گیس بنا دی گئی جس سے دھواں دخان سب اڑ گیا۔

یہی حال انسان نے پانی کے ساتھ کیا، اسے سینکڑوں فٹ نیچے سے اوپر کھینچ نکالا، اسے نہروں، نالیوں میں بہا کر کھیت سیراب کئے۔ غریب اپنے طبعی سیلان سے نیچے کو جاتا ہے، یہ اسے بیس بیس منزلہ مکانوں میں اوپر چڑھالے جاتا ہے اور پھر وہاں سے پٹک دیتا ہے۔ کبھی برف بنا کر جما لیا، کبھی بھاپ بنا کر اڑا دیا۔ بحر اعظم اپنی تمام ہیبت و عظمت کے باوجود انسانی دست برد سے نہ بچ سکا۔ انسان نے سمندر کے جگر چیر ڈالے، اس میں جہاز چلائے، تار روڑائے، آبدوز کشتیوں سے اس کی گہرائیوں پر قبضہ کیا، اس کے مدفون موتیوں کے خزانے اگلوائے۔ اس کے نمکین پانی کو بھی تحلیل کر ڈالا، اس کا نمک الگ کر دیا اور رطوبت الگ۔ اس طرح یہ پانی انسان کے ہاتھوں مجبور بھی ہے اور قید بھی۔

اب ہوا کا معاملہ ملاحظہ فرمایئے جو بہت زیادہ لطیف اور مخفی تھی جس پر انسان کی نگاہ تک فتح نہ پا سکی تھی، لیکن اسے بھی انسان کے ہاتھ میں کھلونا ہی بننا پڑا۔ ہوائی فضا میں

انسانوں کے جہازوں کو ہوا اپنے کندھوں پر سوار کرے پھر رہی ہے۔ انسان کی خبر رسانی کی خدمت اس کے سپرد ہے۔ انسان کے ہاتھوں ذلت اور رسوائی کا حال یہ ہے کہ برقی پنکھوں کو حرکت میں لانے کے لیے ناچ رہی ہے تا کہ انسان کا پسینہ خشک ہو۔ انسان جب اسے قید کرنے پر اترا تو موٹروں کے پہیے میں وہ بند، ائیر گنوں میں گرفتار، ربر کی گیندوں میں محبوس ۔غرض وہ نادیدہ طاقت جس نے سمندروں کو تہ و بالا کر رکھا تھا انسان کے ہاتھوں بے بس و مجبور محض ایک قیدی۔ (ص ۲۰ تا ۲۴)

انسان کی سائنسی ایجادات:

اور انسان ہے کہ وہ اپنی ایجاد پسندی کے جذبہ میں ان عناصر کو فنا کر کے اور انہیں باہم لڑا لڑا کر نئی نئی چیزیں عالم آشکار کرتا رہتا ہے تا کہ کائنات کے دوسرے مدفون خزانوں سے بھی اپنی غلامی کرائے۔ چناں چہ آگ پانی کے درمیان لوہے کا پردہ حائل کر کے آگ کو دھونکا دیا۔ آگ تو جوش میں پانی کو اڑا دینا چاہتی ہے اور پانی کھول کھول کر آگ کو ٹھنڈا کر دینا چاہتا ہے۔ انسان ان کے جوش و خروش سے اسٹیم کی طاقت پیدا کر کے انجن اور مشینیں چلا رہا ہے۔ لاکھوں ٹن لوہا اس بھاپ کی مخفی طاقت پر ناچ رہا ہے، ملیں چل رہی ہیں، مشینیں گھوم رہی ہیں، انجنوں میں کوئلوں کی کانیں پھنک رہی ہیں، مشینوں میں غلہ اور زمین کی پیداوار پس رہی ہے۔ وہ بجلی جو سیکنڈوں میں اقلیموں کی خبر لیتی ہے اور آسمان و زمین ایک کر ڈالتی ہے، اسے تانبے اور جست کے ایک پتلے سے تار میں اس طرح باندھ رکھا ہے کہ وہ اس گرفت سے باہر نہیں جا سکتی۔ پٹرول جیسی سیال اور بہتی چیز میں آگ لگا دی، آگ اور تیل لڑ رہے ہیں جس سے گیس پیدا ہو رہی ہے اور حضرت انسان کی موٹر چل رہی ہے، ہوائی جہاز اڑ رہے ہیں۔

عناصر نے اپنی طاقتوں کے کیا جوہر دکھائے تھے جو اس مجموعہ عناصر نے کر دکھایا۔ بحر و بر، خشکی و تری کی ساری ہی کائنات اس ظالم انسان کی بدولت ایک مصیبت میں گرفتار، کہ کسی وقت چین نہیں ۔ذرہ ذرہ اس سے عاجز۔ انسان کی یہ غلبہ پانے والی قوت غور کرنا چاہئے کہ کہاں سے آئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بدن میں نہیں، بدن تو وہی آگ، پانی اور مٹی کا مجموعہ ہے بل کہ یہ قوت اس کی روح کے سوا کوئی اور چیز نہیں۔ اور یہ روح نہ صرف عناصر اربعہ سے زیادہ لطیف ہے بل کہ تمام مادی عالموں سے زیادہ لطیف شئ ہے۔ اور اسی قاعدہ

کے مطابق کہ جس شئ میں لطافت جتنی زیادہ ہوگی، ذات باری تعالیٰ سے اسکو قرب ومناسبت بھی اسی قدر زیادہ ہوگی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ لطافت ایک وصف کمال ہے اور تمام کمالات کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ تو اب اس پہلو پر بھی توجہ کیجئے کہ جس طرح روح، بدن کے ذرہ ذرہ میں موجود اور بدن کی رگ رگ سے اس کا تعلق، مگر جو تعلق قلب سے ہے وہ دماغ سے نہیں جو دماغ سے ہے وہ کبد ومعدہ سے نہیں اور جو ان اعضاء سے ہے وہ عام جوارح (اور اعضاء) سے نہیں۔ چنانچہ ان اعضاء کی اذیت سے روح میں جو غصہ اور جوش پیدا ہوتا ہے وہ دوسرے اعضاء کی اذیت سے نہیں ہوتا۔۔۔ جب یہ بدنی عناصر جو عالم خلق (دنیائے مخلوقات) کی چیزیں ہیں، اس روح سے تھوڑی سی مناسبت اور واجبی سا لگاؤ پیدا کر کے ایسے قوی ہوسکتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی طاقت پر ناچنے لگتی ہے تو خود روح جو عالم امر کی چیز ہے اور اس کی مناسبت مع اللہ کی گہرائیوں کی کوئی حد ہی نہیں، اللہ جل ذکرہٗ سے اس قوی مناسبت کی بدولت کیا کچھ قوی اور غالب ومتسلط (حاوی) نہ ہوگی۔۔۔ پس جہاں ذات با برکات حق تعالیٰ نے عالم آفاق (دنیا) میں اپنی مثالیں رکھی تھیں تا کہ اس (خالق کائنات) کے کمالات ظاہرہ اور آیات مبینہ کا کسی حد تک ادراک واحساس ہوسکے، اسی طرح بل کہ اس سے بدرجہا زائد اپنی مخصوص مثالیں ہمارے نفس میں رکھ دیں تا کہ اس کے شئون باطنیہ اور کمالات بطون در بطون تک ہم بقدر استعداد کچھ رسائی پاسکیں "**سنریهم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق او لم یکف بربک انه علی کل شیء شهید**"۔۔۔ ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کی گردونواح میں دکھلائیں گے اور ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہوجائے گا کہ وہ حق ہے کیا آپ کے رب کی بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے"۔ (ص ۳۶ تا ۴۰)

کائنات کے تمام موالید پر انسان کے غلبہ اور تفوق کی اصل قوت اس کی روح ہے جیسا کہ اوپر ظاہر ہو چکا۔ اب یہاں حضرت حکیم الاسلامؒ نے ایک سوال قائم کر کے سائنس کے دلدادہ انسان سے جواب مانگا ہے، سوال یہ ہے کہ سائنسی ایجادات کے لیے روح کی قوتوں کو تو استعمال کرلیا گیا لیکن ان تمام قوتوں کو صرف کرنے سے خود روح کو کیا نفع پہنچا؟ ظاہر ہے کہ کچھ بھی نہیں۔ صرف بدن ہی کو نفع پہنچا۔ بدن کی راحت اور جسمانی عیش ہی میں اضافہ ہوا، ہوائی جہاز نے اگر فضا میں اڑایا تو بدن کو، ریلوں اور موٹروں سے اگر نفع ہوا تو

صرف بدن کو، برق و گیس اگر ضیا پاشی کر سکتے ہیں تو اجسام پر، گراموفون اور ٹیلی فون (موبائل)، ٹیلی گراف، لاسلکی (ٹیلی کام اور انٹرنیٹ) اگر منتفع کر سکتے ہیں تو بدن کو۔۔۔اور بدن کیا ہے وہی عناصر اربعہ کا مجموعہ اور آگ پانی ہوا مٹی کا گھروندہ۔ تو یوں کہو کہ آپ نے ان آگ پانی کی ایجادات سے (جسم کے) آگ پانی ہی کو نفع پہنچا دیا۔ اس کے صاف معنی یہ نکلتے ہیں کہ آپ نے روح کو جوان عناصر سے لطیف تر (Rarer) اور بالاتر تھی اور جوان پر حکمرانی کر رہی تھی آپ نے دھوکہ دے کر اس جسم جیسی کثیف (Denser) چیز یعنی عناصر کا غلام بنا دیا۔ (ص ۴۲)

دوسرے الفاظ میں اس کو اس طرح سمجھئے کہ روح جو ایک عالم فاضل فرمانروا ہے، جس میں محسوسات، معقولات اور وجدانیات کے پاکیزہ ملکات ودیعت (قدرت کی طرف سے رکھے گئے) ہیں جو کائنات بدن میں نہیں بل کہ اس کے واسطے سے کائنات عالم (تمام دنیا) پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، عقل اس کا وزیر اعظم ہے اس کا قانون ہے۔ مگر ساتھ ہی ایک کمینہ بدذات خادم بھی ہے جس کے واسطے سے ملک میں شاہی احکام جاری ہوتے ہیں تا کہ وزراء، عمائد (ارکان سلطنت) ان کا نفاذ کریں۔ وہ کمینہ خادم بدن ہے جو عناصر اربعہ کا مجموعہ ہے۔

کمینہ خادم بدن:

کمینہ اس لیے ہے کہ جس قدر بھی اس کے اجزاء ترکیبی ہیں سب بے شعور لایعقل، جاہل اور بے تمیز ہیں جن میں اچھے برے کا کوئی امتیاز نہیں۔ کمینگی کی یہ حالت ہے کہ جو ان سے زیادہ محبت کر کے ان کا قرب حاصل کر لے اسی کے سب سے زیادہ دشمن اور قاتل بن جاتے ہیں۔

ایک انسان مٹی کی مورتیوں اور پتھروں کے وزنی بتوں کے سامنے کتنے ہی طویل زمانے تک سجدے کئے جائے لیکن اگر وزنی مورت اوپر سے آ گرے تو پہلے اپنے اسی مقرب پجاری کا سر پھوڑے گی۔ اسے قطعاً خیال نہ ہوگا کہ یہ میرا محبّ اور عبادت گزار بندہ ہے۔

اسی طرح ایک شخص اگر سینکڑوں برس بھی دریا کے پانی کے سامنے ڈنڈوت کرے ناک رگڑے اور عابدانہ التجائیں کرے لیکن جب بھی سیلاب کی رو آئیگی تو پہلے اسی کو غرق

کرے گی جو اس سے زیادہ قرب حاصل کیے ہوئے ہوگا۔ایک مجوسی برسہا برس بھی آتش کدہ میں سربسجود رہے لیکن آگ اس کی کوئی اعانت نہیں کرسکتی بل کہ اس کی لپیٹ پہلے اپنے اسی مقرب بارگاہ کو پھونکے گی۔(ص ۴۳،۴۴)۔۔۔۔تو جن عناصر کے سفلہ پن کی یہ حالت ہو ان سے مرکب شدہ بدن سے کس خیر کی توقع کی جاسکتی ہے؟

اس کمینہ غلام (بدن انسانی، مجموعہ عناصر اربعہ) نے اپنے ذاتی تعیش کی خاطر روح کو اپنے ڈھب پر لگالیا، عقل دوراندیش سے برسرپیکار کردیا، قانون نقل (احکام خدا، وحی الٰہی اور فرمانِ رسول) کو طاق نسیاں پر پھنکوا دیا، حظوظ نفس (نفسانی لذت) کی تحصیل، عاجل منافع (نقد اور فوری نفع) کی تکمیل کے سبز باغ دکھلا کر روح کو اس کے حقیقی حظوظ (لطف و سرور) اور پائیدار منافع سے بے پرواہ بنادیا۔۔۔۔نتیجہ یہ نکلا کہ بدن کو تو کچھ مل ملا گیا، مگر روح خالی ہاتھ رہ گئی۔ایسی حالت میں اس روح کی اپنی علمی قوتوں سے مادی منافع کا ایک تمدن تو قائم ہو گیا مگر اپنے جوہری کمالات کھوکر۔(اور نوبت یہ آگئی) وہ عملی روح جس سے ان تمام وسائل کارکا وجود تھا وہ اپنے ہر عمل میں خود ان وسائل کے ہاتھوں کو دیکھنے لگی اور وہ روح بھی جو کہیں مسجود ملائک بنی تھی آج عبدالاسباب بن گئی۔(ص ۴۵)۔۔۔۔(حالاں کہ) جب یہ روح اپنی لطافتوں کے سبب اس مالک الملک کی ذات سے مناسبت تامہ رکھتی تھی جو اپنے کسی کام میں وسائل کا محتاج نہیں بل کہ وسائل اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں تو روح ربانی کی شان بھی ایسی ہی ہونی چاہیے تھی کہ وہ اپنے کاروبار میں ایک لمحہ کے لیے بھی ان مادی وسائل کی محتاج نہ ہو۔(ص ۴۷) چناں چہ (یہ محض فرضی بات نہیں ہے بل کہ) روح جب بھی اپنی اصلی فطرت پر چلی ہے تو اس نے مادوں سے اپنی غلامی کروائی ہے۔اسلامی تاریخ کے تابناک واقعات اس پر شاہد ہیں:

☆ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے منبر نبوی پر خطبہ پڑھتے ہوئے "یا ساریَ الجبل" کی صدا مدینہ سے نہاوند کی پہاڑیوں تک عراق میں پہنچادی، حالاں کہ اس وقت لاسلکی کا خواب بھی کسی کو نہ آیا تھا۔

☆ ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہوکر اعلان حج کی ندادی تو وہ عالم کے گوشہ گوشہ ہی میں نہیں بل کہ ماؤں کے رحموں میں چھپے ہوئے بچوں کے بھی کانوں میں

گونج گئی۔

☆ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تخت سلیمانی پر فضا میں پروازیں کیں اور ہوائیں ان کے اشاروں پر چلیں حالانکہ آج کے جہازوں کی ساخت کی طرف اس وقت کوئی ادنی التفات بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فضاء آسمانی بل کہ سارے ہی آسمانوں کا سفر لمحوں میں طے فرمالیا۔

اس طرح کے ہزاروں واقعات تاریخ میں منضبط ہیں جن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ روحانی قوتوں کے مالک مادوں کے غلام کبھی نہیں ہوئے بل کہ مادیات ہی نے ان کے اشارۂ خم ابرو پر ہمیشہ کام کیا اور ان کی غلامی کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ روح کی اصل شان استغناء ہے کہ وہ اپنے منبع وجود ذات حق سے وابستہ رہے اور کسی فعل میں بھی ان مادیات کی جو اس سے بدرجہا کمتر ہیں محتاج نہ ہو، روح کا اصل کمال یہی ہے، مادیت انسان کے لیے کوئی شرافت ہے نہ کوئی کمال۔

عناصر اربعہ کے جبلی اخلاق:

عناصر اربعہ میں احتیاج اور ذلت کے آثار پائے جاتے ہیں۔

عنصر ارض (مٹی):

ارض یعنی مٹی کو ہی لیجیے! اس کی حسی خاصیت پستی اور معنوی یا اخلاقی خاصیت قبض اور بخل ہے۔ جو چیز بھی زمین میں رکھ دی جائے وہ اسے دبا لے گی۔ اب جب کہ یہی قابض اور بخیل مادہ انسان کا جز واعظم ہے تو جبلی (اور فطری) طور پر اس کے نفس میں پہلا خلق یہی قبض اور بخل کا سرایت کرتا ہے۔ پیدا شدہ بچہ کو ذرا بھی ہوش آتا ہے تو وہ قبض اور بخل یعنی لینے اور ہضم کرنے کے لیے چیختا ہے۔ اور یہ قبض و بخل جس کا منشا حرص و طمع ہے، ظاہر ہے کہ محتاجگی اور غلامی پیدا کرتے ہیں، کیوں کہ بخیل آدمی تین باتوں میں مجبور و محتاج ہوتا ہے۔ (۱) چیز کا محتاج۔ (۲) جس کی چیز ہے اس کے عطا کرنے کا محتاج۔ (۳) چیز ملنے کے بعد قلب کو اس سے جدا کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ ہاں قبض و بخل کے بجائے سخا و ایثار پیشہ بن جائے تو اس کا ثمرہ استغناء ہے جس میں عزت و محبوبیت ہوتی ہے، احتیاج اور غلامی نہیں رہتی۔

عنصر نار (آگ):

آگ کی طبعی خاصیت ترفع (بلندی) ہے۔ انسان میں آگ کا بھی وافر حصہ ہے، اس لیے ترفع تعلّٰی، شیخی سے مغلوب ہوجاتا ہے۔ اور یہ بھی سراپا احتیاج وذلت ہے۔ کیوں کہ ترفع وتعلّٰی کا حاصل دوسروں پر بڑا بننے اور اپنے آپ کو انکی نظروں میں بڑا دکھانے کی کوشش کرنا ہے۔ پس اس ترفع کا مدار درحقیقت دوسروں پر اور وہ بھی دوسروں کے خیال پر نکلا۔ جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اگر دوسرے ہی نہ ہوں، یا انکا خیال اس کی بڑائی کی طرف نہ آئے یا اگر ہٹ جائے تو اس کی بڑائی کی عمارت ہی منہدم ہوجائے۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ محتاجگی اور کیا ہوگی کہ عزت ہماری ہو اور قابو میں دوسروں کے ہو۔ اسی بنا پر تعلّٰی وترفع کے لیے مدارات ناس اور تخلق (خاطر مدارات اور آؤ بھگت) بھی لازم ہے تاکہ ان کا خیال بدلنے نہ پائے۔ اس کے بالمقابل تواضع جس کی حقیقت بلا مجبوری و پابندی محض اپنے قصد وارادہ سے کسی کے سامنے جھکنا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کے اس خیال کے محتاج نہیں کہ آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں، آپ جو کچھ بھی ہمیں سمجھیں وہ سمجھیں، مگر ہم تو اپنی اصلیت پر ہیں۔ پس تواضع کا حاصل استغنا اور ترفع کا حاصل محتاجگی ہے۔

عنصر ماء (پانی):

پانی کا طبعی فعل عدم ضبط ہے (یعنی اپنے آپ کو قابو میں نہ کرپانا)، پانی میں اعتماد علی النفس کا شائبہ نہیں۔ وہ اپنے نفس کو خود نہیں روک سکتا۔ ہر طرف سے آپ روک لگائیں رک جائے گا۔ لیکن جہاں بند ٹوٹا یا برتن پھوٹا وہیں پانی بکھرا۔ سیدھا چل رہا ہے اور جہاں ذرا نشیب آیا وہیں بہ گیا، ذرا کسی نے زمین کھود ڈالی اور وہ اپنا مستقر (جگہ) چھوڑ کر وہیں آرہا۔ انسان میں بھی اس مادہ کے ہونے کی وجہ سے ضبط نفس نہیں ہوتا۔ ذرا کسی کی اچھی چیز دیکھی بکھر پڑے، کسی کی عورت پر نظر پڑ گئی تو گھورنے لگے، کسی اچھی عمارت پر نظر پڑی للچائی نظروں سے اسے دیکھنے لگے کاش یہ بلڈنگ ہماری ہوتی۔ مگر اس کا حاصل بھی وہی احتیاج اور بے بسی ہے کیوں کہ غیر کو دیکھ کر قابو میں نہ رہنا اور اپنے نفس کو سنبھال نہ سکنا عدم قدرت اور عجز کی دلیل ہے اور عجز جڑ ہے محتاجگی کی۔ ہاں ضبط نفس اور اچھی سے اچھی چیز دیکھ کر بھی اس سے بے نیاز رہنا (اعتماد اور) قدرت کی دلیل ہے جس کا حاصل وہی استغنا ہے۔

عنصر ہوا میں انتشار اور پھیلاؤ کی خاصیت ہے:

ہر جگہ گھسنا، ہر جگہ بھری رہنا، ذرہ ذرہ اس سے وابستہ رہے، گویا اسے پھیلانا رہے۔ یہ جز جب انسان میں بھی ہے تو وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ ہر جگہ موجود رہوں، ہر جگہ گھسا رہوں۔ اس کے لیے وہ انتشاریت، شہرت اور ہوا بندی چاہتا ہے کہ لوگ جگہ جگہ میرا چرچہ کریں، میرا ذکر پھیلائیں اور اپنے ذکر و تذکرہ کے ذریعہ میں ہر جگہ موجود رہوں۔ اس خلق کا حاصل بھی غیروں کی احتیاج کہ دوسرے ہوں پھر وہ اسے پہچانیں اور اس کے بعد اس کی ہوا بندی بھی کریں، اس کا پروپیگنڈا اور چرچا بھی کریں۔ لیکن شہرت پسندی کی ضد اخفا ہے، اس کی حقیقت دوسروں سے ہمہ تن مستغنی اور بے پرواہ ہو جانا، اس استغنا پر جو قدرتی شہرت کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ اس مصنوعی شہرت سے کہیں زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔

اس طرح مادی جبلت سے رذائل نفس کے چار اصول دریافت ہوئے:

(۱) بغض و بخل (۲) تعلّی و ترفع (۳) شہرت پسندی (۴) انتشار ضبط نفس

مادی اخلاق کا مظہر فعل امساک ہے:

اور ان سب کا حاصل بجز خود غرضی اور خود طلبی کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ بخل ہو یا حرص، شہرت پسندی ہو یا تعلّی، سب کی بنیاد نفس کی اس خواہش پر ہے کہ مال و جاہ سب کا سب ساری دنیا سے کٹ کر تنہا اسی کے دامن ہوس میں سمٹ آئے۔ بخل و حرص میں امساک مالی ہوتا ہے، تعلّی و نام آوری میں امساک جاہی۔

روحانی اخلاق کا مظہر فعل انفاق ہے:

دوسری طرف اسی کے تقابل میں روحانی اخلاق کے اصول بھی چار دریافت ہوئے۔ (۱) سخا و ایثار۔ (۲) تواضع۔ (۳) اخفا و تستر۔ (۴) ضبط نفس و قناعت۔ اور ان اخلاق کا اثر بے غرضی ہے۔ چناں چہ ایثار و تواضع، اخفا و قناعت ہر ایک کی بنیاد اس پر ہے کہ اپنا واجبی حق بھی دوسروں کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ سخاوت میں اپنی چیز دوسروں کو دی جاتی ہے، قناعت میں دوسروں کی چیز انہیں کے لیے چھوڑ دی جاتی ہے۔ تواضع میں اپنی عزت دوسروں پر نثار کی جاتی ہے اور اخفا میں دوسروں کی عزت کے لیے پورا میدان دے دیا جاتا ہے۔ جو فعل ان روحانی اخلاق کے طبعی آثار کو کھولتا ہے وہ فعل انفاق ہے، استغنا مالی ہو یا

استغنا جانی، بغیر فعل انفاق کے کھل نہیں سکتا۔ سخاوت وقناعت میں انفاق مالی ہوتا ہے اور تواضع واخفا میں انفاق جاہی۔ شریعت کی اصطلاح میں اس انفاق ہی کا نام صدقہ ہے جس کے معنی جان ومال، آبرو اور قول وعمل کو مالک الملک کے لیے دینے اور خرچ کرنے کے ہیں، پھر صدقہ کرنے میں چوں کہ محبوبات نفس اور لذائذ طبع کو ترک کرنا پڑتا ہے جو نفس پر شاق ہے اس لیے اس کا دوسرا نام مجاہدہ بھی ہے۔ (ص ۶۱، ۶۲)۔۔ صدقہ سے اثرات یہ مرتب ہوں گے کہ وہ مادی اخلاق جو امساک کا باعث تھے مضمحل اور کمزور پڑ جائیں گے۔ جب صدقہ سے قبض وبخل دور ہوا تو استغنا کا ایک بڑا درجہ حاصل ہوگیا۔ جب عطا ونواز میں لطف محسوس ہونے لگا تو دوسروں کی چیزوں پر نگاہ حرص نہ ڈالے گا تو اس صدقہ اور انفاق کے ذریعہ حرص کا بھی خاتمہ ہوگا اور قناعت پیدا ہوکر استغنا کا دوسرا مقام پیدا ہوجائے گا۔ پہلے مقام پر اپنی چیز سے محبت قطع ہوئی تھی جس سے بخل قائم تھا، دوسرے مقام پر پہنچ کر غیر کی چیز سے محبت جاتی رہی جس سے حرص قائم تھی اور اس طرح ایک انسان مالی سلسلہ میں نہ اپنا غلام رہا نہ دوسروں کا۔ پھر جب یہ صدقہ اخفا کے ساتھ کیا گیا تو شہرت پسندی ونام آوری کی جڑ کٹ گئی، استغنا کا ایک اور مقام حاصل ہوگیا۔ اور اخفاء صدقہ سے ترفع وتعلّی کی بھی جڑ کٹ گئی، اس طرح استغنا کا ایک چوتھا مقام میسر آگیا۔ اپنی نیکی کے اخفا میں اس درجہ مبالغہ کہ بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلے کہ داہنے ہاتھ نے کیا دیا اور کس کو دیا اس سے خود پسندی اور عجب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اس طرح استغنا کا ایک بہت ہی دقیق اور اہم مقام میسر آگیا۔ (ص ۶۳، ۶۴) اور ان روحانی اخلاق کی بدولت عالم میں کسی کا غلام نہ رہا۔ اب اس کا رشتہ کسی سے جڑ سکتا ہے تو صرف اسی خالق کائنات سے جس کی طرف اس نے یہ اپنا مال، اپنی آبرو اور اپنا نفس سب کچھ تج دیا تھا اور جس کے اخلاق سے اس نے یہ اخلاق سیکھے تھے۔ یہ غنا کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ اور غنا کا کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ "علم واعتقاد کے درجہ میں ان (مادی) وسائل کو موثر حقیقی نہ سمجھے اور عمل کے درجہ میں اسے ان اسباب ووسائل سے کوئی شغف باقی نہ رہے بل کہ عادت کے طور پر محض حیلہ (تدبیر) کے درجہ میں اور وہ بھی امر خداوندی سمجھ کر انہیں استعمال میں لاتا ہے"۔

(ص ۶۵، ۶۶)

حاصل یہ کہ مادی اور روحانی اخلاق کے خواص وآثار میں تضاد کی نسبت ہے۔ مادی تصرفات یعنی امساک سے احتیاج اور ذلت نفس کا ثمرہ پیدا ہوتا ہے اور روحانی تصرفات یعنی

صدقہ، مجاہدہ سے استغناو عزت نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے جو اسلام کا موضوع عمل ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اب اس پر غور کیجئے کہ عناصر اور اس سے تیار شدہ بدن محض ایک ڈھانچہ ہے جس کی زندگی روح سے ہے۔ روح اسے زندہ رکھ کر اپنی ترقی و کمالات کو اسی کے ذریعہ عملاً نمایاں کرتی ہے، اس طرح بدن کمالات روح کے ظہور کا ایک ذریعہ اور آلہ ہے۔ چناں چہ روح اپنے مقررہ عمل سے فارغ ہو کر جب اس مقام معلوم تک پہنچ جاتی ہے جو ازل سے اس کے لیے طے شدہ تھا، جب ہی اس ڈھانچہ اور وسیلہ کو اس سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ پس جسم حقیقۃً اصل نہیں بل کہ محض وسیلہ ہے۔۔ لہٰذا سائنس کے تمام کرشمے بھی اصولاً وسائل سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھ سکتے اور اسلام کا موضوع چوں کہ بالاصالت روحانیات اور روحانی افعال ہیں اور روح اصل ہے۔ ان دونوں صورتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ جیسے بدن روح کے لیے وسیلہ عمل ہے ایسے ہی سائنس اصولی طور پر اسلامی کارناموں کے لیے ایک وسیلہ، ذریعہ اور ایک ڈھانچہ ہوگی جس کی زندگی اور روح اسلامی اخلاق و افکار اور اسلامی اقوال و افعال ہوں گے۔ اگر یہ روح اس ڈھانچہ میں نہ ہو تو یہ پوری سائنس اور اس کی تشکیلات ایک لاشہ ہوں گی جس کا انجام بجز پھولنے پھٹنے اور سڑ گل کر صحیح دماغوں اور سچے قلوب کو پراگندہ کرنے اور صاف فضا کو خراب کر دینے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا جو چند دن اپنی چمک دمک اور زینت دکھلا کر خاک کا ڈھیر ہو جانے والا ایک لاشہ ہے، جس پر حقیقت سے بے بہرہ لوگ ہی ریجھ سکتے ہیں، ارشاد حق ہے: **اعلموا انما الحیوۃ الدنیا لعب ولهو و زینة و تفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد کمثل غیث اعجب الکفار نباته ثم یهیج فتراه مصفرا ثم یکون حطاما** ۔۔۔ تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو لعب، زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے جیسے مینہ (بارش) کہ اس کی پیداوار کاشتکار کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ خشک ہو جاتی ہے، سو تو اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے۔ (ص ۶۷ تا ۶۹)

غیر ضروری تعیش (عیش پرستی) اور وسائل جمع کرنے کا نام اسلام کی زبان میں دنیا ہے، جس کے دلدادہ کو احمق اور بے وقوف بتلایا گیا ہے۔ اور دنیائے سائنس اور محفل چار عناصر کے تصرفات کو اسی حد تک حاصل کرنے کی اجازت زبان نبوی پر دی گئی ہے جس حد

تک مذہبی مقاصد میں ان کی ضرورت ہو، ارشاد نبوی ہے: **اعمل للدنیا بمقدار بقائک فیھا و اعمل للآخرۃ بمقدار بقائک فیھا۔** (ص۱۷)

جب معلوم ہو گیا کہ سائنس وسیلہ ہے اور روحانی افعال مقصود تو۔۔ "سمجھ لینا چاہئے کہ ترقی وسائل میں کی جانی چاہئے یا مقاصد میں؟۔۔وسائل میں ترقی اضاعت وقت ہے اور مقاصد میں ترقی کا نام خیرات و برکات ہے۔" اس کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ اہل سائنس اور مسلم یونیورسٹی کے طلبہ سے شکایت اور نصیحت کے طور پر فرماتے ہیں۔۔لیکن آپ نے اپنے طرزِ عمل سے موضوع کو الٹ دیا ہے اور وسیلہ کو مقصود بنا لیا ہے، روحانی افعال اور اسلام کو تو تابع محض اور رسمی و اسمی کر ڈالا ہے اور سائنس کو مقصود حقیقی اور مطلوب اصلی قرار دے لیا ہے۔ جس کا نتیجہ ہلاکت خیزی ہے جو نظروں کے سامنے ہے۔ "مادیات کی یہ ہلاکت آفرینیاں پہلے علم کے میدان میں قدم جماتی ہیں جس سے اعتقاد بگڑتے ہیں پھر عمل کے میدان میں چھا جاتی ہیں جس سے ہمت عمل (روحانی) ختم ہو جاتی ہے۔۔۔یہ مادیات چوں کہ خود محسوسات کی انواع (Species) ہیں اس لیے ان کا دلدادہ انسان زیادہ سے زیادہ حس ہی کی گہرائیوں تک رسائی پا سکتا ہے اور حس کا تعلق حواس خمسہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ سے ہے اس لیے ایک چشم و گوش کا بندہ مشاہدات چشم و گوش ہی میں گھرا رہتا ہے۔ علوم قلب، علوم ارواح اور علم حقائق تک اس کی رسائی ہونے ہی نہیں پاتی۔ اور ظاہر ہے کہ جس علم کی راہ سے آدمی ناواقف محض ہو اور ناواقفی کے ساتھ ادھر کا رخ بھی کرے تو اس کا مبلغ پرواز بجز اوہام و خیالات اور شکوک و شبہات کے، علوم و معارف کب ہو سکتے ہیں؟ اسی لیے مادی انسانوں کو روحانی میدان میں شکوک و شبہات ہی گھیرے رہتے ہیں جو درحقیقت مادیات میں انہماک و شغف رکھنے کا ایک معمولی ثمرہ ہے، اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ روحانیت کی طرف رجوع کر کے جو منشاءِ علوم و ادراکات ہیں قلب میں علم کی شمع روشن کی جائے جس سے اوہام و وساوس کی یہ اندھیریاں رفع ہو جائیں اور یہ باتیں بغیر صحبت اہل اللہ کے حاصل نہیں ہوتیں۔ (ص۷۴، ۷۵)

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے خطاب کی ابتدا میں ترمذی شریف کی حدیث نقل کی تھی جس میں اللہ تعالیٰ سے فرشتوں نے حیرت و استعجاب کے طور پر چند سوالات کیے جس

کیے۔ وہ سوالات اور ان کے جواب ذکر کرنے کے بعد عناصر اربعہ کا تذکرہ ایسے بلیغ پیرایہ میں فرمایا گیا کہ ان عناصر کے شدت وضعف، اور حسی ومعنوی خواص وآثار کے باہمی مراتب پر روشنی پڑ گئی پھر موالید کی ترکیب کی اعلی ترین مثال انسان کی طرف توجہ فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ ان سب سے قوی اور شدید انسان ہے۔ لیکن علی الاطلاق نہیں بل کہ اس شرط کے ساتھ کہ وہ صدقہ اور مجاہدہ کے ذریعہ روحانی بنے۔ یعنی جان ومال، آبرو اور قول وعمل کو مالک الملک کے لیے خرچ کرے اور اپنی عملی زندگی میں روحانی اعمال واخلاق کو مقصد زندگی بنا کر اختیار کرے۔

اللهم وفقنا لما تحب وترضى واجعل آخرتنا خيرا من الاولى

(ممکن ہے کوئی صاحب خیال کریں کہ عناصر کی تعداد تو چار سے کہیں زائد بلکہ سو سے بھی زائد ہے۔ہم کہتے ہیں کہ عناصر کی تعداد کے متعلق جو تحقیق علم عناصر (Elementology) سے وابستہ افراد نے کی ہے وہی درست ہے۔ اور مذکورہ عناصر کے جیسے چار ہونے میں کلام ہے ویسے ہی مٹی، آگ، پانی، ہوا کے عناصر کہلانے میں بھی کلام ہے۔ مثلاً پانی، یہ مرکب ہے ہائڈروجن اور آکسیجن سے اور ہائڈروجن اور آکسیجن الگ الگ تو عنصر ہے، مگر پانی ان دونوں کا مرکب ہے، عنصر (بسیط) نہیں، لیکن اس قسم کی فنی گفتگو یہاں مدنظر نہیں ہے بل کہ اصول اور کلی حیثیت سے ان مادوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ ارضی، ناری، مائی اور ہوائی اجزاء پر جسم انسانی مشتمل ہوا کرتا ہے، اور یہی چاروں قسم کے مادے انسان کی ساخت میں شامل اور داخل ہیں، اب خواہ ان کا تجزیہ کر کے کتنے ہی اقسام اور عناصر وجود میں آجائیں۔)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں

اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں کہ اس وقت علوم دینیہ کے مدارس کا وجود مسلمانوں کے لیے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے فوق متصور نہیں، دُنیا میں اگر اسلام کے بقاء کی کوئی صورت ہے تو یہ مدارس ہیں، کیوں کہ اسلام نام ہے خاص اعمال وعقائد کا جس میں دیانات، معاملات ومعاشرت اور اخلاق سب داخل ہیں اور ظاہر ہے کہ عمل موقوف ہے علم پر اور علوم دینیہ کی بقاء ہر چند کہ فی نفسہٖ مدارس پر موقوف نہیں، مگر حالات وقت کے اعتبار سے ضرور مدارس پر موقوف ہے۔

سیکولر تعلیم اور مسلمان
(مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ)

حکیم فخر الاسلام الہ آبادی

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ النبی الأمین ۰

☆ ''بڑا سبب وہ کالجوں کا لادینی ماحول ہے جس میں ہماری نئی نسل پلتی اور ڈھلتی ہے، جس کی وجہ سے قلوب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ عظمت ومحبت باقی نہیں رہتی، جو ایمان کے لیے ضروری ہے''، اس کا علاج یہ ہے کہ بزرگ علماء وصلحاء کی مجلسوں کے ماحول میں اپنی تعطیلات کا کچھ حصہ خرچ کریں۔ (حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

☆ انگریزی اور سیکولر تعلیم کا حکم: عقائد اگر خلاف شریعت ہوگئے تو کفر والحاد۔ بد دینوں کی صحبت کے اثر سے اعمال خراب ہوجائیں، تو فسق ظاہری، اور اگر دل میں یہ ارادہ اور عزم جما ہوا ہے کہ ذریعۂ معاش خواہ حلال ملے یا حرام، اسے اختیار کریں گے، تو فسق باطنی، اور اگر کوئی ان عوارض سے مبراء ہو اور عزم بھی یہ کرے کہ اس سے وہی معاش حاصل کریں گے جو شرعاً جائز ہوگی، تو اس کے لیے انگریزی تعلیم مباح اور درست ہوگی، اور اگر اس سے بڑھ کر یہ قصد ہو کہ اس کو ذریعۂ خدمت دین بناویں گے، تو اس کے لیے عبادت ہوگی۔

(فتوی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ ملخصا)

☆ چند باتوں کا اہتمام والتزام کرلیں، ''اس کے بعد تعلیم جدید حاصل کرنے کا مضائقہ نہیں۔'' (حکیم الامت حضرت مولانا اشرف تھانوی)

☆ مادیات کی ہلاکت آفرینیاں پہلے علم کے میدان میں قدم جماتی ہیں، جس سے اعتقاد بگڑ جاتے ہیں، پھر عمل کے میدان میں چھاجاتی ہیں، جس سے ہمتِ عمل ختم ہوجاتی ہے۔ (قاری محمد طیب صاحبؒ)

☆ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ، اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت ہے، عام تعلیمی اداروں میں جو نصاب تعلیم رائج ہے، اور جس ماحول میں بچے وہاں تعلیم پاتے ہیں، اس میں نہ صرف یہ کہ اسلام کی اخلاقی اقدار، بل کہ خود ایمان کو محفوظ رکھنا بھی کارے دارد ہے۔

(شیخ اسلام مفتی محمد تقی عثمانی)

☆ مسلمان تعلیمی ادارے خود قائم کریں اور بچوں کو ابتدا ہی سے دینی ماحول فراہم کیا جائے، یہ مسلمانوں کی موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔(مفتی محمد تقی عثمانی)

☆ سیکولر تعلیم و تہذیب کے بیچ ابتدائی مذہبی تعلیم اور دینی مکاتب کی اہمیت: بچوں کو ہم ابتدائی اردو ضرور پڑھاتے ہیں تا کہ اردو لٹریچر سے انکا رشتہ برقرار رہے۔

(جزیرہ ری یونین، اور ویسٹ انڈیز کے مسلمانوں کی دینی حمیت اور مذہبی غیرت)

☆ سیکولر نظام تعلیم کا تعارف: سائنس کا درجہ تو وسیلہ کا تھا کہ اس کی تحقیقات وانکشافات کی روشنی میں اللہ کی معرفت اور روز جزا میں اللہ کے سامنے اس کے انعامات واحسانات کی جواب دہی کا احساس زیادہ سے زیادہ بڑھتا جاتا۔لیکن ہوا یہ کہ سائنس کے ساتھ انکارِ آخرت اور اس دنیا میں چمٹ جانے والے تصور حیات ابھارنے والا نظریہ وابستہ کر دیا گیا۔

☆ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فکری تحریکوں کو تقویت دینے والے اور اسلام کا گہرا علم رکھنے والے لوگ۔

(۱) وہ افراد ہیں جنہوں نے اس کام کے لیے علمی اسلحے فراہم کیے۔

(۲) اہل اسلام گم کردہ راہ۔اس کی ایک مثال کمال اتاترک کا ترکستان ہے، جہاں دینی تعلیم ممنوع قرار دے دی گئی، عربی اذان پر پابندی اور ہیٹ کا استعمال لازمی قرار دیا گیا۔

(۳) اہل اسلام تجدد پسند افراد۔یعنی ایسے دانشور جنہوں نے مغربی افکار کے غلبے کے بعد، عالم اسلام کے تجدد پسند حلقے کو مغربیت اور تجدد پسندی کے واسطے علمی اسلحے فراہم کیے۔

☆ ''علم شیٔ بہتر از جہل شیٔ'' کا بے ضرر اصول، لیکن نصابِ تعلیم اور نظام تعلیم، غیر نصابی سرگرمیاں اور گمراہ کن افکار کی شمولیت کی وجہ سے خطرناک نتائج۔

☆ سیکولرزم ''سکہ رائج الوقت'' کے شوق میں جو لوگ اسلامی علوم کی تعلیم بے فائدہ سمجھتے ہیں۔(مفتی محمد تقی عثمانی)

☆ سیکولر تعلیم کہ اہداف ومقاصد۔

☆ تعلیمی سیکولرائزیشن کا مقصود اور ماحصل: معاشرہ کو ماقبل مرادی معاشرے (Prefigurative) میں تبدیل کرنا، جہاں بڑے اور عمر دراز لوگ بچوں سے علم سیکھتے ہیں۔جبکہ مابعد مرادی (Postfigurative) وہ معاشرہ کہلاتا ہے، جہاں بچے اپنے اسلاف سے علم سیکھتے ہیں جو کہ اصل طریقہ ہے اور روحانیت پیدا کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔

بڑا قصور کالجوں کے اس لادینی ماحول کا ہے جس میں ہماری نئی نسل پلتی اور ڈھلتی ہے

غالباً شملہ کے کسی کالج میں حضرت تھانویؒ کا بیان ہوا۔ مخاطب کالج کے لڑکے اور اساتذہ تھے۔ اس بیان میں حضرتؒ جدید تعلیم سے پیدا شدہ شبہات کا ذکر فرما رہے تھے جو اسلام کے اصول و فروع کے متعلق اکثر لوگوں کو پیش آتے ہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ ان شبہات و اشکالات میں صرف نصاب تعلیم ہی کا قصور نہیں۔ بڑا سبب وہ کالجوں کا لادینی ماحول ہے، جس میں ہماری نئی نسل پلتی اور ڈھلتی ہے، جس کی وجہ سے قلوب میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ عظمت و محبت باقی نہیں رہتی جو ایمان کے لیے ضروری ہے۔ اور یہ عظمت و محبت بزرگوں کی صحبت و مجالست سے نصیب ہو سکتی ہے۔

جدید تعلیم کے اثر سے دین کے باب میں جو شبہات پیدا ہوتے ہیں اس سے بچنے کا طریقہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: بزرگ علما و صلحا کی مجلسیں بحمد اللہ ہر جگہ کچھ نہ کچھ قائم ہیں۔ کچھ دن اس ماحول میں رہنے کی عادت ڈالیں اور زیادہ نہیں تو اپنی تعطیلات کا کچھ حصہ ہی اس کام کے لیے خرچ کریں۔ اگر وہ ایسا کر لیں گے تو مجھے امید ہے کہ شبہات کا بیج ہی دلوں میں سے نکل جائے گا۔ اور خود بخود صحیح جواب سمجھ میں آنے لگے گا۔

(مجالس حکیم الامتؒ از مفتی محمد شفیع صاحبؒ، ملفوظات حکیم الامت جلد ۲۴/ص ۹۳)

حضرت حکیم الامتؒ نے تعلیم انگریزی کی ضرورت و عدم ضرورت کے متعلق تین اہم سوال کیے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

(۱) انگریزی پڑھنے سے نیت کیا ہے؟

(۲) انگریزی پڑھنے کے قواعد کیا ہیں؟ (۳) کورس کیا ہے؟

(انفاس عیسیٰ حصہ دوم ص ۳۵۰)

کہ انہیں باتوں پر انگریزی تعلیم کا حکم موقوف ہے۔ آگے حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا فتویٰ ملاحظہ ہو۔

مسلمان کے لیے انگریزی سیکھنا اور سیکولر اداروں میں سیکولر تعلیم حاصل کرنا، کیا حکم رکھتا ہے:(حضرت حکیم الامت تھانوی کا فتوی)

انگریزی مثل اور زبانوں کے ایک مباح (جائز) زبان ہے، مگر تین عوارض سے اس میں خرابی آجاتی ہے:

اول بعض علوم اس میں ایسے ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں اور علم شریعت سے واقفیت ہوتی نہیں، اس لیے عقائد خلاف ہو جاتے ہیں، جس میں بعض عقائد قریب کفر بل کہ کفر ہیں۔

دوسرے اگر ایسے علوم کی بھی نوبت نہ آئے تو اکثر صحبت بددینوں کی رہتی ہے، ان کی بددینی کا اثر اس شخص پر آجاتا ہے، کبھی اعتقاداً جس کا حکم اوپر معلوم ہو چکا ہے (کہ عقائد شریعت کے خلاف ہو جاتے ہیں جو کبھی تو کفر کے قریب ہوتے ہیں اور کبھی کفر تک پہنچ جاتے ہیں۔ف) کبھی عملاً جس سے نوبت فسق کی آجاتی ہے۔

تیسرے اگر صحبت بھی خراب نہ ہو یا وہ (خراب صحبت ہو لیکن) موثر نہ ہو تو کم از کم اتنا ضرور ہے کہ یہ نیت رہتی ہے کہ اس کو ذریعۂ معاش بناویں گے خواہ طریقہ معاش حلال ہو، یا حرام۔ اور یہ مسئلہ عقلاً و نقلاً ثابت ہے کہ جو مباح ذریعہ کسی حرام کا بن جائے وہ حرام ہو جاتا ہے۔ پھر ایسا عزم جو معاصی قلب سے ہے (یعنی دل کا ارادہ اور عزم اس گناہ کے ساتھ شریک ہے کہ طریقہ معاش خواہ حلال ہو یا حرام ہو جو بھی ملے، اسی ذریعہ معاش بنالیا جائے گا۔ف) تو اس صورت میں فسق ظاہری کے ساتھ کیا فسق باطنی (قلب کا گناہ) بھی ہے۔

ان عوارض ثلاثہ کی وجہ سے گاہے کفر و الحاد تک، گاہے صرف فسق باطنی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

(عقائد اگر خلاف شریعت ہو گئے تو کفر و الحاد، بددینوں کی صحبت کے اثر سے اعمال خراب ہو جائیں یا طریقہ معاش حرام کیا جائے تو فسق ظاہری۔ اور اگر دل میں یہ ارادہ اور عزم جما ہوا ہے کہ ذریعۂ معاش خواہ حلال ملے یا حرام، اُسے اختیار کریں گے، تو فسق باطنی۔ف)۔

انگریزی تعلیم کا حکم:

اگر کوئی ان عوارض سے مبرا ہو یعنی عقائد بھی خراب نہ ہوں جس کا آسان طریقہ بلکہ متعین طریقہ یہی ہے کہ علم دین حاصل کر کے یقین کے ساتھ اس کا اعتقاد رکھے اور اعمال بھی نہ خراب ہوں، عزم بھی یہ رہے کہ اس سے وہی معاش حاصل کریں جو شرعاً جائز ہوگی اور پھر اسی کے موافق عمل در آمد بھی کرے، تو ایسے شخص کے لیے انگریزی مباح اور درست ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ قصد ہو کہ اس کو ذریعہ خدمت دین بناویں گے تو اس کے لیے عبادت ہوگی۔ لیکن اس کی اخیر صورت میں (یعنی ذریعہ خدمتِ دین بنانے کے لیے) پاس حاصل کرنا (یعنی ڈگریاں لیے جانا) اس دعوے کا مکذّب (غلط ثابت کرنے والا) ہوگا کیوں کہ اس خدمت دین کے لیے صرف استعداد کافی ہے۔ حاصل یہ کہ انگریزی کبھی حرام ہے، کبھی مباح، کبھی عبادت۔ واللہ اعلم ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۲ھ۔ (امداد الفتاوی: ج۶/ص ۱۵۶، ۱۵۷)

بچوں کے دین کی فکر اور علم دین سے وابستگی کا خیال اگر نہ رکھا گیا تو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ ’’بیس سال بعد تمہاری اولاد یہودی ہوگی اور کچھ نصرانی ہوگی۔‘‘ (انفاس عیسیٰ حصہ دوم) لہٰذا تعلیم جدید اگر حاصل کرنا ہو تو وہ اس کی شرائط ذکر کرتے ہیں:

تعلیم جدید کی تحصیل کی شرائط:

(۱) اپنے مذہب کی تعلیم حاصل کرے۔

(۲) کسی عالم کے مشورے سے کورس مقرر کر کے مطالعہ کرے۔

(۳) علماء حقانی کی کتابیں مطالعہ میں رکھے۔

(۴) علماء حقانی کی صحبت میں آمد و رفت رکھے۔

(۵) غیر جنس کی کتابوں (مختلف رسالے، اخبارات، ناول، ملحدوں بد دینوں کی مضامین میں، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور موبائل کے ذریعہ فحش خیالات اور مغرب اخلاق پروگرام۔ف) سے اعراض رکھے۔ اس کے بعد تعلیم جدید حاصل کرنے کا مضائقہ نہیں‘‘۔

عصری تعلیم کا عملی فسق والحاد ممکن ہے کفر وارتداد کے لیے وقایہ ہو سکے:

حضرت حکیم الامت کا درج ذیل واقعہ ملاحظہ فرمائیے لیکن یہ ذہن میں رہے کہ یہ مبتلا بہ افراد کے لیے ہے (یعنی وہ افراد جن کو انگریزی تعلیم ہر حال میں حاصل کرنا ہی ہے اور

انہیں بصد کوشش روکا نہیں جاسکتا) نہ کہ یکسو اور خالی الذہن افراد کو سیکولر ایجوکیشن کی ترغیب دلا کر اور حدیث وقران میں آئی ہوئی علم کی فضیلت کو اس پر چسپاں کر کے اسی آتش کدہ میں تمام قوم کو جھونکتے چلے جانے کے لیے۔ اور اگر چہ یہ ملفوظ عمل بدعت کے متعلق ہے، (یعنی کفر اور بدعت کے سلسلے میں اضطراری کیفیت کے پیشِ نظر اھـون البـلیتیـن اور اخف الـضـررین کے فقہی اصول کی روشنی میں جو قرآن وحدیث سے مستنبط ہے، کفر سے بچانے کے لیے بدعت کی اجازت دی جاسکتی ہے، مگر ظاہر ہے کہ اِسے عموم پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔) زیرِ بحث مضمون میں بھی اشتراک علت سے حکم کا تعدیہ اگر ممکن ہو تو اب یہ واقعہ ملاحظہ کی جئے: فرمایا ہندو بھی گیارھویں دیتے ہیں اور ان کے لیے عبادت ہے اور مسلمانوں کے لیے بدعت ہے۔ پھر فرمایا میں زمانہ اِرتداد میں مقام بُجَیرُ (فتح پور ہسوہ کے قریب ہے، کانپور اور الٰہ باد کے بیچ میں) گیا۔ وہاں جا کر ایک رئیس سے کہا کہ سنا ہے تم ہندو ہونے والے ہو۔ اگر کچھ شبہات ہوں تو دریافت کر لو۔ اس نے کہا نہیں صاحب! بھلا ہم کیسے ہندو ہو سکتے ہیں ہم تو تازیہ بناویں (یعنی ہم تو تازیہ بناتے ہیں) میں نے کہا کہ بھائی تازیہ نہ چھوڑنا۔ میرے ہمراہیوں نے کہا کہ یہ کیا کیا کہ بدعت کی اجازت دے دی؟ میں نے کہا کہ میں نے بدعت کی اجازت نہیں دی بل کہ مِن حَیۡثُ اَنَّھا الوِقَایَۃ لِلۡکُفۡرِ (یہ عمل ان کو کفر سے بچانے والا ہے۔ ف) جب تک تازیہ بناتے رہیں گے تب تک مرتد نہ ہوں گے، اور وہاں میں نے چند مولود کرنے والے مولویوں کو کہا کہ یہاں مولود کے نام سے ایک مجلس کر کے شیرنی تقسیم کر دو تا کہ لوگ اس بہانہ سے جمع ہوں مگر میں بالکل شامل نہ ہوں گا۔ وہاں لوگ وعظ کے نام سے جمع نہ ہوتے تھے بل کہ مولود کے نام سے جمع ہوتے تھے۔ ہم نے اتنی وسعت کر دی۔ باوجود اس کے پھر بھی ہمیں لوگ متشدد کہتے ہیں۔ (الکلام الحسن۔ ملفوظات حکیم الامت جلد ۲۶/ص ۴۶۵)

حضرت تھانویؒ کا تعزیہ کی اجازت دینا اور خود شریک نہ ہونا۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خواص اہلِ علم اور صلحاء کو سیکولر تعلیم کے مختلف پروگراموں، کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں کی تقریبات جن میں منکر، خلاف شرع امور ومعاصی پر مشتمل متعدد اجزاء ہوتے ہیں، شریک نہ ہونا چاہیے، اور نہ ہی بے ضرورت ان کی تائید وحمایت کرنی چاہیے۔ اِلّا یہ کہ منکر کی اصلاح مقصود ہو۔

وسیلہ اور مقصود کا فرق پیش نظر رہنا ضروری ہے:(قاری طیب صاحبؒ)

مادیات کی ہلاکت آفرینیاں پہلے علم کے میدان میں قدم جماتی ہیں جس سے اعتقاد بگڑ جاتے ہیں۔ پھر عمل کے میدان میں چھا جاتی ہیں جس سے ہمتِ عمل ختم ہو جاتی ہے۔

نظر کالج میں بس ان کی رہی علمی فوائد پر گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

(اکبر الہ آبادی)

غیر ضروری تعیش (عیش پرستی) اور وسائل جمع کرنے کا نام اسلام کی زبان میں دنیا ہے، جس کے دلدادہ کو احمق اور بے وقوف بتلایا گیا ہے۔۔اور دنیائے سائنس اور محفل چار عناصر کے تصرفات کو اسی حد تک حاصل کرنے کی اجازت زبان نبوی پر دی گئی ہے جس حد تک مذہبی مقاصد میں ان کی ضرورت ہو، ارشاد نبوی ہے: **اعمل للدنیا بمقدار بقائک فیھا و اعمل للآخرۃ بمقدار بقائک فیھا۔**(ص ۱۷)

جب معلوم ہو گیا کہ سائنس وسیلہ ہے اور روحانی افعال مقصود تو۔۔"سمجھ لینا چاہئے کہ ترقی وسائل میں کی جانی چاہئے یا مقاصد میں؟۔۔وسائل میں ترقی اضاعت وقت ہے اور مقاصد میں ترقی کا نام خیرات و برکات ہے۔" اس کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ اہل سائنس اور مسلم یونیورسٹی کے طلبہ سے شکایت اور نصیحت کے طور پر فرماتے ہیں۔۔لیکن آپ نے اپنے طرز عمل سے موضوع کو الٹ دیا ہے اور وسیلہ کو مقصود بنا لیا ہے، روحانی افعال اور اسلام کو تو تابع محض اور رسمی و اسمی کر ڈالا ہے اور سائنس کو مقصود حقیقی اور مطلوب اصلی قرار دے لیا ہے۔ جس کا نتیجہ ہلاکت خیزی ہے جو نظروں کے سامنے ہے۔"مادیات کی یہ ہلاکت آفرینیاں پہلے علم کے میدان میں قدم جماتی ہیں جس سے اعتقاد بگڑتے ہیں پھر عمل کے میدان میں چھا جاتی ہیں جس سے ہمت عمل (روحانی) ختم ہو جاتی ہے۔۔۔یہ مادیات چوں کہ خود محسوسات کی انواع (Species) ہیں اس لیے ان کا دلدادہ انسان زیادہ سے زیادہ حس ہی کی گہرائیوں تک رسائی پا سکتا ہے اور حس کا تعلق حواس خمسہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ سے ہے اس لیے ایک چشم و گوش کا بندہ مشاہدات چشم و گوش ہی میں گھرا رہتا ہے۔ علوم قلب، علوم ارواح اور علم حقائق تک اس کی رسائی ہونے ہی نہیں پاتی۔ اور ظاہر ہے کہ جس علم کی راہ سے آدمی ناواقف محض ہو اور ناواقفی کے ساتھ ادھر کا رخ بھی کرے تو اس کا مبلغ پرواز

بجز اوہام وخیالات اور شکوک وشبہات کے، علوم ومعارف کب ہوسکتے ہیں؟ اسی لیے مادی انسانوں کو روحانی میدان میں شکوک وشبہات ہی گھیرے رہتے ہیں جو درحقیقت مادیات میں انہماک وشغف رکھنے کا ایک معمولی ثمرہ ہے، اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ روحانیت کی طرف رجوع کرکے جو منشاء علوم وادراکات ہیں قلب میں علم کی شمع روشن کی جائے جس سے اوہام ووساوس کی یہ اندھیریاں رفع ہوجائیں اور یہ باتیں بغیر صحبت اہل اللہ کے حاصل نہیں ہوتیں۔ (ص ۷۴،۷۵)

علم حقائق تک رسائی اور خالق کائنات کے احکام کا علم بالفظ دیگر علم دین ہی درحقیقت اصل علوم ہیں۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ وتعبیرات میں اس کی وضاحت سنئے:

علوم دنیا کو علم مت کہو، فن کہو، پیشہ کہو، صنعت وحرفت کہو:

(حضرت تھانوی قدس سرہٗ)

فرمایا کہ علم کا شرف، معلوم (یعنی جن چیزوں کا علم حاصل کیا جارہا ہے، اس) کے شرف پر موقوف ہے اور معلوم اس کو کہتے ہیں جس کے حالات اس علم میں بیان کئے جاتے ہیں اور ہر علم کا معلوم جدا ہوتا ہے۔ جس علم کا معلوم جس درجہ میں ہے اسی درجہ میں علم بھی ہوتا ہے مثلاً علم فلاحت کا معلوم زراعت یعنی کھیتی کرنا ہے اور کناسی کا معلوم پاخانہ ہے۔ جو نسبت ان دونوں معلوموں میں ہے یعنی کھیتی اور پاخانہ میں وہی نسبت ان کے علموں میں بھی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ پاخانہ نجس اور ارذل چیز ہے اور زراعت صاف ستھری اور ذی شرف چیز ہے، لہٰذا علم کناسی ارذل (ذلیل) ہوگا اور علم فلاحت اشرف۔ اور علم کناسی (نجس مقامات کی صفائی کا فن)، علم فلاحت کے سامنے علم کہلانے کا مستحق بھی نہ ہوگا اسی طرح علم دین کا معلوم حق تعالیٰ کی ذات وصفات اور احکام ہیں تمام علم دین کا حاصل یہی ہے اور دیگر تمام علوم کا معلوم دنیا یا ماسوی اللہ ہے پس جو نسبت دنیا یا ماسوی اللہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ ہے وہی نسبت علوم دینویہ کو ہوگی علم دین کے ساتھ۔ اور نسبت کے متعلق بجز اس کے کیا کہا جاسکتا ہے ۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

حق تعالیٰ کی ذات وصفات کو تو کسی چیز کے ساتھ نسبت نہیں دی جاسکتی، وہ باقی اور

سب فانی، وہ زندہ اور سب مردہ، وہ غنی اور سب محتاج۔ وہ موجود اور سب معدوم، کل شیء ھالک الا وجھہ۔ غرض دونوں چیزوں میں کوئی نسبت نہیں قرار دی جاسکتی۔ سوائے اس کے علم دین پر موجود کا اطلاق کیا جائے اور دیگر علوم پر معدوم کا۔

اب میرا دعویٰ قریب الفہم ہو گیا کہ علوم دین کے سامنے دیگر علوم علم کہلانے کے مستحق نہیں، مقابلہ تو کیا کیا جائے۔ علوم دنیا کو علم مت کہو۔ فن کہو، پیشہ کہو، حرف (حرفت، صناعت) کہو۔

مفید چیزیں سیکھنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ حدود کے اندر ہو:

جو چیزیں مفید ہوں، ان کے سیکھنے کی اجازت ہے لیکن موجب فضیلت اور جزو دین نہ کہو۔ دیکھئے پڑوسی کے بھی حقوق ہوتے ہیں، جن کو سب دنیا مانتی ہے، لیکن اس بات کو کوئی عقل مند جائز نہیں رکھتا، نہ شریعت یہ تعلیم دیتی ہے کہ اس کو باپ بنالو، اس کو میراث دو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کا ہر بات میں جائز لحاظ کرو اور قدر کرو، اس کو احتیاج ہو اس کی مدد کرو لیکن اس کی حد رکھو جو پڑوس کے لیے مناسب ہے، ذوی القربیٰ (رشتہ داروں) پر مقدم نہ کرو۔ اسی طرح ان تمام چیزوں کو جو مفید ہیں سیکھنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ حدود کے اندر ہوں لیکن ان کو کوئی امر شرعی یا باعث فضیلت اور جزو دین مت کہو۔

(انفاس عیسیٰ: ج ۲/ص ۲۷۰، از مولانا عیسیٰ صاحب الہ بادی، ملفوظات حکیم الامت)

اور مقصود زندگی تو علم دین کی تحصیل اور اس پر عمل ہونا چاہیے چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ ’’علم و عمل ہی سے کمال شرعی حاصل ہوتا ہے اور اسی سے کمال دنیوی یعنی عقل حاصل ہوتی ہے عقلاء حقیقت میں وہی ہوتے ہیں جو علم و عمل کے جامع ہیں۔ نہ وہ جن کو تم عقلاء سمجھتے ہو۔ جو لوگ علم دین حاصل کر چکے ہیں، ان کے سامنے بڑے بڑے انگریزی داں جنہوں نے علم دین حاصل نہ کیا ہو، بے وقوف ہیں۔ چناں چہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اُولٰئک الَّذِیْنَ ھَداھُمُ اللہ وَ اُولٰئک ھم اولوا الالباب ۔ یعنی جو لوگ شریعت کا کامل اتباع کرتی ہیں۔ علماً وعملاً وہی ٹھیک راستے پر ہیں اور وہی عقلاء ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے سامنے جب کوئی اہل یورپ کو عقلمند کہتا تو نہایت برہم ہوتے اور فرماتے تھے کہ جو قوم خدا کو بھی نہ پہچانے وہ خاک عقلمند ہے۔ ہاں یوں کہو کہ چاقو، قینچی بنانا جانتے ہیں۔ یعنی کاریگر اچھے

ہیں۔ اور صنعت کو عقل سے کیا واسطہ عقل کا کام تو علم معرفت ہے۔ (انفاس عیسیٰ: ج۱/۳۰۴) اور علوم معرفت ہمیشہ مسلمانوں کے پاس رہے۔ اس کے متعلق بھی حکیم الامت کا ملفوظ ملاحظہ ہو۔

علوم ہمیشہ مسلمانوں میں رہے:

فرمایا کہ غیر قوموں میں علوم کبھی ہوتے ہی نہیں۔ علوم ہمیشہ مسلمانوں میں رہے اور اب بھی ہے۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی مسلمانوں کے علوم کا دوسرے لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ باقی یہ ایجادات سوان کو علم سے کیا تعلق۔ یہ تو صنعت اور فرحت ہے۔

(انفاس عیسیٰ حصہ دوم ص ۲۴۰، ملفوظات ج ۲۲)

سیکولر تعلیم و تہذیب کا اثر دینی مدرسہ تک:

۔۔۔ اب سنا یہ جاتا ہے کہ طلبہ کا تو بالکل ہی طرز بدل گیا۔ یہی پتہ نہیں چلتا دیکھنے سے کہ یہ علی گڑھ کالج ہے یا دینی مدرسہ۔ اپنے بزرگوں کا طرز چھوڑ دیا۔ پھر نور و برکت کہاں۔ یہ سب اسی کمبخت نیچریت کی نحوست ہے۔ طلبہ کے لباس میں طرز معاشرت میں نیچریت کی جھلک پیدا ہوگئی۔ (انفاس عیسیٰ حصہ دوم ص ۲۵۱)

سیکولر تعلیم کا نتیجہ الحاد و نیچریت کبر و بدفہمی:

اور درحقیقت اسی تعلیم انگریزی کے بدولت الحاد اور نیچریت کا غلبہ زیادہ ہو گیا ہے۔ یہ کالج کیا ہے فالج ہیں کہ دین کی حس کو بالکل تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ان کے تعلیم یافتہ اکثر بد دین ملحد ہوتے ہیں دماغوں میں خناس بھر جاتا ہے۔

(انفاس عیسیٰ حصہ دوم از مولانا عیسیٰ صاحب الہ آبادیؒ، ملفوظات حکیم الامت: ج ۲۲/ص: ۲۰)

فرمایا اس منحوس تعلیم انگریزی کا یہ اثر ہے کہ اس میں بجز کبر کے اور کچھ نہیں اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں اور دوسروں کو چھوٹا سمجھتے ہیں یہ خلاصہ ہے اس تعلیم انگریزی کا۔

(ایضا/ص ۲۱۲)

فرمایا کہ اکثر بدتمیزی کا سبب بے تعلیمی نہیں بل کہ تعلیم ناقص ہے ورنہ یہ سب امور (باتیں) فطری ہیں، اگر تعلیم بھی نہ ہوتب بھی ان بدتمیزوں کا صدور نہ ہونا چاہیے یہ تعلیم ہی کا اثر ہے کہ بدتمیزی کرتے ہیں مگر وہ تعلیم ناقص ہے۔

(انفاس عیسیٰ حصہ دوم۔ ملفوظات حکیم الامت: ج ۱۲/ص ۲۱۳)

فرمایا کہ انگریزی خوانوں (انگریزی پڑھنے والوں) کے یہاں معیار مقبولیت صرف یہ ہے کہ وہ چیز نئی ہو چاہے کتنی ہی بعید از عقل ہو (چاہے عقل اس کو بالکل نہ مانے جیسے نظریۂ ارتقاء) مگر ہو نئی اس کو قبول کر لیتے ہیں اور کوئی بات کتنی ہی قریب از عقل ہو مگر ہو پرانی اس کو قبول نہ کریں گے۔ (انفاس عیسی: حصہ دوم/ص ۴۴۹)

کالج کا وہ لادینی ماحول اور اس کے متعدی اثرات جس میں ہماری نئی نسل پلتی اور ڈھلتی ہے: (مفتی محمد تقی عثمانی)

سیکولر تعلیم کا الحادی رنگ مسلمانوں کے اندر دیکھنے کے لیے کسی خوردبین کی ضرورت نہیں ہر کالج، ہر سیمینار، ہر کانفرنس، بل کہ تمام پروگراموں اور کنونشنوں میں دیکھا جا سکتا ہے اس کا مشاہدہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی آنکھوں سے کر لیجیے، فرماتے ہیں: امریکہ میں مسلمانوں کی ایک تنظیم "فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشنز (ایف، آئی، اے) نے اپنا سالانہ کنونشن امریکی ریاست ویسٹ ورجینیا کے مرکزی شہر چارلسٹن میں منعقد کیا۔۔۔۔اس کنونشن کے دوران پکنک، کشتی رانی اور ڈنر کے جو پروگرام ترتیب دیئے گیے ان میں خوردبین لگا کر بھی اسلام کی نہ صرف کوئی جھلک نظر نہ آسکی، بل کہ بعض ایسی چیزیں بھی ان پروگراموں کے دوران سامنے آئیں جنہیں دیکھ کر پیشانی عرق عرق ہو گئی۔۔۔۔
(مفتی محمد تقی عثمانی۔ جہان دیدہ: ص ۴۸۳)

یہ چیز کالج کے لادینی ماحول ہی کے متعدی اثر کے نتیجہ میں سمناروں اور پروگراموں میں داخل ہوئی کہ "جس میں ہماری نئی نسل پلتی اور ڈھلتی ہے"۔ (فخر الاسلام)۔ اسی مشاہدہ اور تجربہ کا اور وضاحت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے مفتی تقی عثمانی صاحب، مسلمانوں کے قومی اور مذہبی تشخص کے لیے اس کا طریقہ بھی ذکر کرتے ہیں اور حساس مسلمانوں کی طرف سے اس سلسلہ میں کیے گیے بعض حوصلہ افزا اقدامات کی قدر کرتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں۔

کالج کے لادینی ماحول میں بچوں کی تعلیم وتربیت، سب سے بڑا مسئلہ: (مفتی تقی عثمانی)

۔۔۔۔مغرب میں آزادی فکر اور آزادی رائے کا خواہ کتنا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہو لیکن عملاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزادی فکر اور رائے کے یہ خوبصورت اصول مسلمانوں کے لیے وضع نہیں ہوئے، دوسری طرف مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت ہے،

عام تعلیمی اداروں میں جو نصاب تعلیم رائج ہے، اور جس ماحول میں وہاں بچے تعلیم پاتے ہیں اس میں نہ صرف یہ کہ اسلام کی اخلاقی اقدار، بل کہ ایمان کو محفوظ رکھنا بھی کارے دارد ہے۔ لہٰذا مغرب میں رہنے والا ہر حساس مسلمان اس بات کے لیے فکر مند ہے کہ وہ کس طرح اپنی اولاد کو اسلام پر برقرار رکھے۔ (دنیا میرے آگے: ص ۱۲۰) ۔۔۔مفتی محمد تقی عثمانی صاحب آگے ارشاد فرماتے ہیں: اس مسئلہ کا اصل حل تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے الگ ہوں جہاں مسلمان بچے اسلامی ماحول میں پرورش پاسکیں۔ اور اس سمت میں بعض کوششیں شروع بھی ہوئیں ہیں۔ مختلف مغربی ملکوں میں مسلمانوں کے اپنے تعلیمی ادارے قائم ہورہے ہیں، جن میں سے بعض مجھے بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا اور یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ان اداروں میں بچوں کو عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ نہ صرف مناسب مقدار میں دینی معلومات فراہم کی جارہی ہیں، بل کہ ان اداروں کا مجموعی ماحول ان کی دینی اور اخلاقی تربیت میں مفید کردار ادا کررہا ہے۔ (ص ۱۲۰، ۱۲۱، حوالہ بالا)

اس کے علاوہ یہ بات بھی مناسب طور پر محسوس ہوتی ہے کہ وہاں کے حساس مسلمانوں کو اپنے بچوں کی تربیت کی خصوصی فکر ہے اور قدم قدم پر بچوں کی نقل وحرکت کی نگہداشت کرتے ہیں اور اپنے گھریلو ماحول میں بھی انہیں اسلامی اقدار کا پابند بنانے کوشش کرتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے طرزِ عمل سے بچوں کے ذہن میں یہ بات بٹھادی ہے کہ انکا قومی اور مذھبی تشخص مغرب کے باشندوں سے جدا ہے۔۔۔

(دنیا میرے آگے: ص ۱۲۱)

مسلمان تعلیمی ادارے خود قائم کریں اور بچوں کو ابتدا ہی سے اسلامی ماحول فراہم کیا جائے۔ یہ مسلمانوں کی موت اور زندگی کا مسئلہ ہے:

تعلیمی اداروں کے ماحول سے تحفظ کے لیے اگر خصوصی نگرانی نہ کیا جائے تو دین و ایمان، اخلاق واعمال کے تحفظ کا کوئی راستہ نہیں۔ (مفتی محمد تقی عثمانی)

۔۔۔آسٹریلیا کے مسلمان بھی ان مسائل کا شکار ہیں جو غیر مسلم ملکوں، بالخصوص مغربی ممالک میں مسلمانوں کو درپیش ہیں، ان میں سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی تعلیم وتربیت کا ہے۔ جب بچے ملک کے عام تعلیمی اداروں میں پڑھتے ہیں تو وہاں کے ماحول سے انکا متاثر

ہونا لازمی ہے۔اور اگر والدین ان کی خصوصی نگرانی نہ کریں جو بہت ہی مشکل کام ہے تو ان کے دین وایمان اور اخلاق واعمال کے تحفظ کا کوئی راستہ نہیں چنانچہ جو والدین اس پہلو سے اپنی اولاد کی فکر نہیں کرتے، وہ اپنی اولاد کو ہاتھ کھو چکے ہیں۔خاص طور سے لڑکیوں کا مسئلہ انتہائی سنگین ہے اور ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں کہ لڑکیوں نے غیر مسلموں سے شادی رچالی اور والدین دیکھتے رہ گئے، اس مسئلہ کا کوئی حل اس کے سوا نہیں کہ مسلمان اپنے تعلیمی ادارے خود قائم کریں اور بچوں کو ابتدا ہی سے اسلامی ماحول فراہم کیا جائے۔میں ان تمام ممالک میں اس ضرورت پر زور دیتا رہا ہوں اور یہ عرض کرتا رہا ہوں کہ یہ مسلمانوں کی موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔(دنیا میرے آگے،ص/۲۱۷)

سیکولر تعلیم و تہذیب کے بیچ ابتدائی مذہبی تعلیم اور دینی مکاتب کی اہمیت:

جزیرہ ری یونین میں فرانسیسی تہذیب اپنی پوری فتنہ سامانیوں کے ساتھ چھائی ہوئی ہے، اور سیاحت کا ایک بڑا مرکز ہونے کی وجہ سے جدید مغربی تہذیب کے تمام لوازم یہاں موجود ہیں لیکن اس ماحول میں مسلمان اپنا دینی تشخص اس طرح قائم کئے ہوے ہیں کہ بہت سے مسلم ملکوں میں بھی دینی غیرت وحمیت اور اسلامی شعائر کی پابندی کے وہ مناظر نظر نہیں آتے جو یہاں نظر آتے ہیں اس کی بنیادی وجہ انہی علماء کرام کی مخلصانہ جدوجہد ہے، یہ دیکھ کر خاص طور پر بڑی مسرت ہوئی کہ یہاں کے تمام دینی حلقوں میں مکمل اتحاد واتفاق، اور یگانگت ہے۔۔۔کوئی مسلم گھرانہ ایسا نہیں ہے کہ جو اپنے بچوں کو کسی اور کام میں لگانے سے پہلے مسجد میں ملحق مکاتب میں ابتدائی دینی تعلیم نہ دلواتا ہو، چنانچہ تمام مسلمان جو بچپن میں ان مکاتب سے گزر کر زندگی میں داخل ہوئے ہیں، اسلام کی بنیادی تعلیم سے آراستہ ہیں۔جوان کے روز مرہ معمولات میں واضح طور پر جھلکتی ہیں۔ (دنیا مرے آگے،ص۸۵۔۸۶)

مجھے یہاں ''المرکز الاسلامی'' نے بعض اجتماعی اور بعض فقہی مسائل میں مشورے کے لیے مدعو کیا تھا۔۔۔سوالات کی ایک طویل فہرست پہلے سے تیار تھی، اور ان پر گفتگو چار طویل مجلسوں میں مکمل ہوئی، ان سوالات ہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ مرکز کو عام مسلمانوں کے مسائل سے کس قدر دلچسپی ہے، اور ان مسائل کے بارے میں دنیائے اسلام کے اہل علم کی تازہ ترین تحقیقات جاننے کے لیے کتنے بے تاب ہیں۔(ایضا از مفتی تقی عثمانی،ص۸۶)

غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کے اندر سیکولر تعلیم اور سیکولر معاشرہ کے برخلاف دینی تعلیم وتربیت اور دینی معاشرہ سے وابستگی کا رجحان:

بارے دوس (Barbados) میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے، اگرچہ مسلمانوں کی یہ تعداد جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں بہت تھوڑی سی ہے لیکن قابل صد تبریک وستائش ہیں کہ انھوں نے اپنا اسلامی تشخص پورے اہتمام کے ساتھ اس طرح باقی رکھا ہے کہ ان کا دینی جذبہ بہت سے مسلم ملکوں کے باشندوں سے بھی کہیں زائد ہے۔ برج ٹاون کے چھوٹے سے شہر ہیں دو شاندار مسجدیں ہیں جن میں باقاعدہ لاوڈ اسپیکر پر اذان ہوتی ہے۔ دونوں مسجدوں میں بچوں کی دینی تعلیم کے لیے مدرسے قائم ہیں ہر مسلمان بچہ اسکول کی چھٹی کے بعد لازماً دو گھنٹے ان مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتا ہے جہاں اسے بنیادی اسلامی تعلیمات فراہم کی جاتی ہے حافظ بچوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ بارے دوس کا کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو بچپن میں ان مدرسوں میں نہ پڑھا ہو۔ یہیں سے وہ پختہ اسلامی عقائد واعمال سیکھ کر ایک مسلمان کی طرح اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ ایک مدرسہ میں میرا خود جانا ہوا جہاں اس وقت تقریباً اسی نوے بچے زیر تعلیم تھے بچوں نے دلکش آواز میں قرآن کریم کی تلاوت کی میرے سوال کرنے پر مختلف اوقات میں پڑھی جانے والی مسنون دعا سنائیں۔ ان کے انگریزی لب ولہجہ سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں یہ اردو الفاظ یاد کرنے میں کتنی وقت ہوئی ہوگی؟ لیکن اساتذہ کا کہنا تھا کہ انہیں ہم ابتدائی اردو ضرور پڑھاتے ہیں تا کہ اردو لٹریچر سے ان کا رشتہ برقرار رہے۔'' (دنیا مرے آگے ص ۱۲۶، ۱۲۷)

ـــــ متعدد دینی مجلس بھی رکھی گئیں دو مجلسیں خواتین کے لیئے بھی رکھی گئیں۔ اور خواتین پردے کے مکمل اہتمام کے ساتھ ان میں بڑی تعداد میں شریک ہوئیں۔ (ف)

میں بارے ڈوس میں پانچ دن رہا ـــــ اور یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ اس دور افتادہ جزیرے میں جو مغربی سیاحت کے تمام فتنوں میں گھرا ہوا ہے اور جس کے بارے میں یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ یہاں شادی کا زیادہ رواج نہیں بل کہ مرد وعورت کسی باقاعدہ شادی کے بندھن سے وابستہ ہوئے بغیر ایک ساتھ رہنا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح تقریباً ستر فیصد غیر مسلم آبادی بغیر شادی کے پیدا ہوئی ہے، ایک ایسے ماحول میں مسلمانوں کا دینی شعور

کتنا پختہ اور ان کے عقائد واعمال کتنے راسخ ہیں؟ تحقیق سے پتہ چلا کہ دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ بعض علما نے یہاں انتھک کام کر کے مسلمان آبادی کو دینی شعور سے بہرہ اندوز کیا ہے۔ اب بھی دارالعلوم دیوبند، ڈابھیل اور ہندوستان اور پاکستان کے دینی مدارس کے متعدد، فارغ التحصیل علما یہاں مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اور ان کی مخلصانہ خدمات کی برکت کھلی آنکھوں نظر آتی ہے۔ (دنیا مرے آگے: ص ۱۲۷ تا ۱۲۸)

ناروے:

ناروے کے اسکولوں میں عیسائی مذہب کی تعلیم تمام بچوں کے لیے کچھ عرصہ سے لازمی کر دی گئی ہے، اور مسلمان بچے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اس موضوع پر گفتگو کے لیے یہاں کے مسلمانوں نے کچھ اعتدال پسند عیسائی پادریوں سے اگست ۲۰۰۰ء کو میری ایک ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔۔۔ یہ ملاقات اس لحاظ سے مفید رہی کہ ان تمام پادری صاحبان نے اس بات کا اعتراف کیا کہ مسلمانوں کو عیسائی مذہب کی تعلیم پر مجبور کرنا سراسر زیادتی ہے اور پابندی کو اٹھوانے میں مسلمانوں کے ساتھ تعاون کریں گے۔ (دنیا میرے آگے: ص ۲۸۵ تا ۲۸۶)

آئندہ اوراق میں سیکولرزم کی کسی قدر وضاحت اور سیکولر تعلیم کے اہداف ومقاصد پر روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ مسلمان اس کے سمّی اثرات کا مشاہداتی حالات میں ادراک کر سکیں۔

مغربی سیکولر فکر:

اللہ کو انسان کے اجتماعی معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں اور یہ کہ انسان ان سے معاملات طے کرنے میں مختار مطلق ہے (سیکولزم)، وہ آزاد ہے کہ اپنی زندگی جیسے چاہے گزارے (لبرلزم) اور جو چاہے کرے، کوئی طاقت اس کے فیصلے پر قدغن نہیں لگا سکتی (ہیومنزم) دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے لہٰذا اس کی بہتری اور اس کی کامیابی ہی ہر وقت پیش نظر رہنی چاہیے (مٹیریلزم) علم حقیقی صرف وہ ہے جو ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتا ہے اور کسی غیبی علم (وحی) کی کوئی اہمیت، سیادت اور برتری تسلیم نہیں کی جاسکتی (امپریلیزم)۔

(ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل- ڈاکٹر محمد امین ص ۳۳۹)

سیکولر فکر کے تحت انکار آخرت اور دنیا میں چمٹ جانے والے تصور حیات کو ابھار کر

نیز دنیوی امور میں مذہبی مداخلت کو ممنوع قرار دے کر سیکولر تعلیم و ترقی کا مینوفیسٹو تیار ہوا۔ اور سائنس کے ساتھ بھی انکار آخرت اور انکار خدا کے نظریات جوڑ کر اور مادہ کے فرسودہ فلسفیانہ یا ملحدانہ بے دلیل بل کہ خلاف دلیل افکار شامل کر کے بے راہ روی اور لذت پرستی کی راہ ہموار کی گئی سیکولر دماغ کا اپنی قوت و کاوش اور عقل و فکر پر اس قدر اعجاب نفس میں مبتلا ہونا کہ تسخیر اشیا اور ایجادات و اکتشافات کے پیچھے کسی خالق کی قدرت کاملہ نظر نہ آئے، یہ بجائے خود اس مغربی سیکولر معاشرہ کا عبرتناک پہلو ہے۔ حضرت تھانویؒ اس کی طرف عجیب پیرایہ میں توجہ دلاتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ''موجدان یورپ کا دعوی ہے کہ ہم نے ایسی ایسی ایجادیں کی ہیں۔ حالاں کہ ان سب ایجادوں کی جو چیز جڑ ہے وہ کسی کے بھی اختیار میں نہیں یعنی کسی صورت صنعت کا قوت فکریہ میں فائض ہو جانا اگر یہ ان کے اختیار میں تھا تو قوت فکریہ تو بیس برس پہلے بھی تھی۔ اس وقت کیوں وہ صورت ذہن میں نہیں آئی۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات ذہن سے اتر جاتی ہے تو لاکھ قوت فکر کو عمل میں لائے وہ یاد ہی نہیں آتی۔ کسی بات کا سوجھا دینا یہ حق تعالی کے اختیار میں ہے''۔ (کمالات اشرفیہ ملفوظات حکیم الامت جلد ۲۳ ص ۴۶)

تمام چیزیں اللہ تعالی کے اختیار میں ہیں وہ خلق و امر کا، آخرت اور جزا کا اور قضا و قدر کا مالک ہے سیکولرزم کی ماہیت میں انہیں چیزوں کا انکار شامل ہے۔ اس موضوع کے ماہرین کے حوالہ سے سیکولرزم کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سیکولر نظام تعلیم کا تعارف:

وی۔ ایم۔ تارکنڈے سپریم کورٹ کے سابق جج سیکولرزم کے متعلق لکھتے ہیں:

سیکولرزم ایک فلسفہ اور ذہنی توجیہ کا اظہار کرتا ہے، جس کے مطابق کسی مافوق الفطرت (Supernatural) قوت کو اس کا حق نہیں کہ وہ دنیوی امور میں مداخلت کرے۔ یعنی آخرت نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہ تصور اس بات کی طرف لے جاتا ہے کہ قضا و قدر کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور یہ کہ انسان میں یہ قوت ہے کہ وہ اپنی عقل کی بنیاد پر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے۔ اس مفہوم میں سیکولرزم کو ملحدانہ ہیومنزم سے الگ کوئی چیز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوسرا معنی زیادہ عوامی ہے۔ اس کا ایک طویل تاریخی ارتقا کا پس منظر ہے۔ بارھویں صدی عیسوی سے یورپ نشأۃ ثانیہ کی تحریک سے گزرا جو کئی صدیوں پر محیط ہے

عیسائی کلیسا اور مذہبی طبقے کے غلبہ کے خلاف یہ ایک تحریک تھی۔ لازماً یہ ایک ہیومنزم کی تحریک تھی جس نے رفتہ رفتہ پورے یورپی معاشرے کو سیکولرائز کر دیا۔ انکار آخرت اور اس دنیا میں چمٹ جانے والے تصور حیات کو ابھار کر اس نے سائنس کی ترقی کے راستے کھولے۔

(عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال ص ۴۱۸۔۴۱۹)

تمام مغربی جمہوریتوں میں سیکولر ریاست کے ظہور سے پہلے ان کے متعلقہ معاشروں میں سیکولرائزیشن کا طویل عمل گزرا ہے، لیکن چوں کہ ہندوستانی معاشرے کے قابل لحاظ حد تک سیکولر ہو جانے سے قبل ہی آزادی حاصل کر لی گئی لہٰذا ہندوستان میں پورے طور پر سیکولرزم کے نفاذ کے لیے عمل سیکولرائیزیشن کی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے۔ اور وی ایم تارکنڈے سپریم کورٹ کے سابق جج کے الفاظ میں ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کو ایک عوامی تحریک ہونا ہوگا۔ تاکہ لوگ اس کا ادراک کر لیں کہ انہیں اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں میں لینی ہوگی، اگر انہیں اپنی معاشی اور معاشرتی پسماندگی پر قابو پانا ہے فرقہ وارگی کا علاج ایسے افراد کا فروغ ہے جو آزادی پسند، خود کفیل اور اخلاقی طور پر خود بیدار ہوں۔ ایسے افراد کسی اجتماعیت میں ضم نہیں ہوتے، نہ ہی اپنے کو اس سے مشخص کرتے ہیں۔ وہ کسی گروہ سے تعلق نہیں رکھتے اس لیے کہ وہ خود اپنے ہوتے ہیں۔ درست بات یہ ہے کہ انہیں کاسموپالیٹن ہومنسٹ کہا جانا چاہیے۔

مساوات اور اخوت کی بنیاد پر ایسے افراد کا تعاون ان کے معاشی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے کے لیے فرقہ وارگی، ذات پات اور تنگ نظر قومیت کے فساد کو کم کر کے تقریباً ختم کر دے گا۔ ”ہومنزم“ سیکولر ڈیماکریسی کی فلسفیانہ بنیاد ہے۔

ہندوستان کو جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ یہ ہیں: آزادی کے ہومنسٹ اقدار، ریشنلوم، لوگوں کے تمام طبقات میں خود فراہم کردہ اخلاقیات (یعنی کارپوریشن Corporation۔ف) کا پھیلاؤ۔ کوئی ضروری نہیں کہ اس کے لیے کھلم کھلا الحاد کی تبلیغ ہو۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو خدا یا کسی غیر شخصی مافوق الفطرت وجود پر یقین رکھتے ہیں لیکن وہ خود کو کسی مخصوص مذہب کا فرد قرار نہیں دیتے اور اس طرح گویا فرقہ وارگی سے آزاد ہیں۔ انہیں مذہبی ہیومنسٹ کہا جاتا ہے۔ (عالم اسلامی کی اخلاقی صورت حال، ص ۴۴۲)

سیکولرزم کیا چاہتا ہے مذکورہ بالا عبارت سے اس کا اندازتو بخوبی ہو گیا لیکن یہاں

بڑی اہم بات یہ ہے کہ سیاسی طور پر اسٹیٹ میں خواہ لادینی جمہوریت رائج ہو یا اشتراکیت لیکن تعلیم کے باب میں ایسے متعدد ممالک کا مزاج مذہب مخالف ہی رہا ہے چناں چہ اشتراکی نظام کے حامل ملک:

''چین میں قانون بنایا گیا کہ اٹھارہ سال سے کم عمر بچے کو کوئی مذہبی تعلیم نہیں دی جاسکتی۔ اگرچہ اس قانون پر عملدرآمد کے سلسلہ میں موجودہ حکومت نے (نومبر ۱۹۸۵ء میں) قدرے نرم اور لچکدار پالیسی اختیار کی ہوئی ہے اور اس معاملہ میں عملاً زیادہ داروگیر نہیں کی جاتی''۔ (جہان دیدہ:ص/۴۷۰)

مذہب دشمنی کے تحت مذہب بے بیزار کرنے والے حالات منظم طریقے سے معاشرے میں پیدا کئے گئے اس کے لیے سیکولرزم اور ملحدانہ ہیومنزم کے علمبرداروں نے زہد، پاکیزگی اور فقہ کے خلاف لوگوں کو ابھارنا شروع کیا۔۔ اور فکر آخرت کو ذہنوں سے محو کرنے کی کوشش کی گئی بعض تصانیف میں یہ ثابت کیا گیا کہ آخرت اور بعث بعد الموت کچھ نہیں۔ مذہب کی اصل حقیقت انسان کو اس دنیا میں مدد پہنچانا ہے تا کہ وہ اپنی زندگی گذار سکے۔

اس انسانی کائنات کے علاوہ کوئی کائنات نہیں۔ (ایضا:ص/۵۹،۶۰)

جرمنی، ہالینڈ، اسپین، برطانیہ، فرانس، اٹلی میں ہومنسٹوں نے تعلیم اور عمائدین ملک کو مرکز توجہ بنایا تھا۔ جس سے پروٹسٹنٹ کا طبقہ ظہور میں آیا اور عیسائیت کے مذہبی خیالات وعقائد سے باغی ہوا۔ ف) پھر یہ پروٹسٹنٹ یہودیت کے ہاتھوں کھلونا بن گئے۔۔۔ اصل عیسائیت میں ان کی کوئی جگہ نہ تھی اور یہودی ان سے اپنا کام نکال چکے تھے۔۔۔ خود مارٹن لوتھر کو جب اس کا احساس ہوا تو وہ بے دست و پا ہو چکا تھا۔

(عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال ص/۶۳)

پہلا سیکولر تعلیمی نظام:

یہودیوں کی طرف سے پہلا تعلیمی نظام وہ تھا جس کے تحت عالم عیسائیت کے افراد اپرنٹس (Apprentice) کی حیثیت سے داخل کئے جاتے اور تربیت و تعلیم کے بعد انہیں جرنی مین ((Journeymen) کی حیثیت سے تنظیم میں شامل کرلیا جاتا۔ یہ جرنی مین سارے عالم عیسائیت میں یہودی سازشوں کو عوام اور متوسط طبقہ میں پورا کرنے والے ثابت ہوئے۔ اس نظم سے الگ ایک اور قسم کی تربیت گاہ تھی جہاں افراد داخل کئے جاتے اور

انہیں خصوصی تربیت دی جاتی۔ بعد میں یہ افراد Knights کی حیثیت سے حکومت کے اعلیٰ عہدوں میں داخل کرادیئے جاتے، رفتہ رفتہ پورے عالم عیسائیت میں جرنی مینوں نے عوام الناس کو اور نائٹوں نے حکومت کو اپنی مٹھی میں کرلیا۔ اس عہد میں انہیں افراد کے ذریعہ یورپ کی وہ جدید یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جو ان تمام خیالات کو منظم طور پر پھیلاتے کی بالآخر شاکلہ قرار پائیں۔ (اخلاقی صورت حال، ص ۵۵)

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف علمی اور فکری تحریکوں کو تقویت دینے والے عوامل جن لوگوں نے عیسائی جکڑ بند کے بندھن توڑے انہوں نے مسلمانوں کے عظیم ورثے سے استفادہ کیا، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فکری تحریکوں کو تقویت دینے اور انہیں علمی اسلحہ فراہم کرنے کا کام بھی انہی مستشرقین نے کیا جو اسلامی علوم میں اختصاص رکھتے تھے اور اسلامی علوم کے مطالعہ اور تحقیق کے لیے وقف تھے۔

"آئرلینڈ کے شہر ڈبلن کے دو کتب خانوں کی سیر بڑی دلچسپ رہی اپنے اسلاف کی کتابوں کے بھی وہ عظیم ذخیرے ہیں جو یورپ کے مختلف شہروں میں بکھرے ہوئے ہیں اور جن کو دیکھ کر شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا ؎

وہ حکمت کے خزانے، وہ کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں جا کے یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

سولہویں صدی عیسوی سے پہلے دنیا بھر میں علم وفن کے سب سے بڑے مراکز عالم اسلام میں تھے، اس وقت غیر مسلم یورپ علم و ہنر اور فن و حکمت سے بحیثیت مجموعی اتنا آشنا نہیں تھا اور اس معاملہ میں عالم اسلام کا محتاج تھا۔ یورپ کے حکمراں اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے اندلس بھیجا کرتے تھے۔ لیکن شامت اعمال سے جب مسلمانوں کی اپنی بدعملی سے ان کا سیاسی زوال ہوا تو عالم اسلام کا علمی سرمایا فاتحین یورپ کی طرف منتقل ہونا شروع ہوا۔ اندلس کے زوال کے بعد وہاں برسر اقتدار آنے والی عیسائی حکومت تو اس درجہ متعصب اور علم دشمن تھی کہ اس نے مسلمانوں کے کتب خانے نذر آتش کردیے اور علم و حکمت کے نہ جانے کتنے خزانے غرناطہ کے چوراہوں پر مہینوں تک جلتے رہے۔ لیکن ہمارے اسلاف نے ہر موضوع پر جو ذخیرہ تیار کیا تھا، وہ اس کے باوجود تمام تر فنا نہ ہوسکا۔ کچھ علم دوست لوگوں نے اس وقت

بھی مسلمانوں کی کتابیں چوری چوری چھپا کر رکھیں، جب ایسی علم دوستی عیسائی تفتیش (Enquisition) کے ہاتھوں اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی اور پھر رفتہ رفتہ جب یورپ میں وسیع المشربی کا چرچہ ہوا تو ان کتابوں سے استفادے کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔۔۔(اور) ہر علم وفن میں اختصاص (Specialistion) رکھنے والے اسکالرز پیدا کئے گئے، خواہ عملی زندگی سے علم کے اس گوشے کا کوئی تعلق بھی نہ ہو۔۔۔

یورپ کی نشأۃ ثانیہ (Renaisance) کے اسباب میں ایک اہم سبب یہ ہی تھا کہ جن لوگوں نے عیسائی جکڑ بند کے بندھن توڑے، انھوں نے مسلمانوں کے اس عظیم ورثے سے استفادہ کیا۔۔۔جن لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو فکری تحریکیں پروان چڑھانی منظور تھیں، ان کی تقویت کے لیے علمی اسلحہ انہی مستشرقین نے فراہم کیا (جو اسلامی علوم میں اختصاص رکھتے تھے اور۔ف) جو اسلامی علوم کے مطالعے اور تحقیق کے لیے وقف تھے۔ (دنیا میرے آگے: ص ۲۳۱ تا ۲۳۳)

اس مسلمان سیکولر طبقے کی خواہش جو اسلام کا عمیق علم رکھتا ہے:

"مذہب میں ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جو پچاس سالوں کے بعد ہی سہی، اسلام کے قاعدے کو بدل ڈالیں"۔

سیکولرائزیشن کے لیے سب سے خطرناک رجحان اسلام پر حملہ کرنے کے بجائے اسے نہایت دقت نظر سے اندرون میں کہیں مولڈ (Mould) کرنے کی ہے، اس کے لیے۔۔۔ایسے اہلِ مغرب جو اسلام کا عمیق علم رکھتے ہوں، دوسرے ایسے اہلِ اسلام جو اسلام کا عمیق علم رکھنے کے ساتھ ساتھ سیکولرائزیشن کے عمل میں ان کے ساتھ ہوں۔ یہ دونوں طبقات دو نہایت خطرناک مشن لے کر اٹھے ہیں، لیکن ان میں دوسرا مشن بے انتہا سنگین ہے، یہ طبقہ علانیہ اسلام کا مذاق اڑانے والا اور اسلامی طرز زندگی سے نا آشنا نہیں بل کہ اسلام کی گہری اور حیرت میں ڈال دینے والی معلومات رکھنے والا اور اسلامی طرز زندگی رکھنے والا طبقہ ہے۔ وہ جزوی اور سطحی تبدیلیوں کے بجائے ایسی بنیادی تبدیلیاں لانے کا خواہشمند ہے جو پچاس سالوں کے بعد ہی سہی، اسلام کے قاعدے کو ہی بدل ڈالے۔ یہ مشن سڑکوں پر نہیں بلکہ علمی اکاڈمیوں میں اور عملی سطح پر نہیں بل کہ نظریہ سازی کی سطح پر انجام دیا جارہا ہے۔

عالم مغرب کے کارل مارکس اور میکس ویبر کو مسلط کرنے کے طریقے کی ناکامی کے بعد اب اس کی کوشش ہو رہی ہے کہ خود عالم اسلام میں کارل مارکس اور میکس ویبر پیدا کیے جائیں۔ ۱۹۵۰ء سے تصوراتی سطح پر، ۱۹۷۰ء کے بعد تجربہ گاہ کی سطح پر اور اب اکادمیوں کی سطح پر انجام دیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے کل اس کو عوامی سطح پر انجام دیا جائے۔

(اخلاقی صورت حال، ص ۳۶۱، ۳۶۲)

اسلام کا تصور علم جس سے راہ حق کی روشنی ملا کرتی تھی اور جیسے جیسے علم بڑھتا جائے اللہ کی خشیت میں بھی اضافہ ہوتا جائے "انا اعلمکم باللّٰهِ وَ اَخشاکُم لله" کا واضح ارشاد موجود ہونے کے باوجود جب اس علم کو عمل اور اطاعت سے بے نیاز کر کے "علم برائے علم" کے سطح پر لے آیا جائے گا تو پھر اس کے لیے ایمان و اسلام کی بھی کیا حاجت رہ جائے گی۔

جو علم انسان کو اپنے خالق و مالک تک پہنچا کر اسے ایمان بھی نصیب نہ کر سکے، "علم برائے علم" (مفتی محمد تقی عثمانی):

میکگل یونیورسٹی (مانٹریال۔ کناڈا) میں اسلامی علوم کا شعبہ دنیا بھر میں مشہور ہے، عصر حاضر کے متعدد مشہور مستشرقین اسی یونیورسٹی سے پیدا ہوئے اور بہت سے مسلمان اسکالر بھی یہاں سے اسلامی علوم میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے فخر محسوس کرتے ہیں، چناں چہ عالم اسلام کے بہت سے تجدد پسند مصنفین جو مستشرقین جیسی فکر کے حامل تھے، یہیں سے پیدا ہوئے۔ (جہان دیدہ: ص ۵۸۹) اس یونیورسٹی کے اسلامی اسٹڈیز کے شعبہ کے نصاب تعلیم پر صرف ہلکی سی نظر ڈالنے سے پتہ چلا کہ اوپر کی (علیا) جماعتوں میں مندرجہ ذیل موضوعات کی تدریس نصاب میں شامل ہے:

(۱) مشرق وسطیٰ کی تاریخ۔

(۲) بیسویں صدی میں عربوں کے افکار۔

(۳) مسلم ہندوستان کی تاریخ۔

(۴) اسلامی روایت جس میں قرآن کریم، سیرت طیبہ (صلی اللہ علیہ وسلم)، عقائد، اعمال، اور اداروں کا تاریخی مطالعہ شامل ہے۔

(۵) اسلامی تہذیب کے کلاسکی عہد کی تاریخ۔
(۶) فاطموں کی تاریخ۔
(۷) قرون متوسط میں اسلامی تہذیب کی تاریخ۔
(۸) اسلامی افکار کے ارتقاء کا جائزہ۔۔۔اس کے علاوہ تفسیر، قرآن، اسلامی فلسفے، اسلامی اصول فقہ۔۔ایران اور پاکستان میں اسلامی ارتقا، احیاء اسلام کی تحریکیں، بنیاد پرستی کی تحریک۔۔۔جیسے موضوعات بھی تعلیم کے مختلف مراحل میں شامل نصاب ہیں۔

موضوعات تو یہ سب ہیں لیکن عبرتناک بات وہ ہے جسے مفتی تقی عثمان صاحب نے آگے تحریر فرمایا ہے، فرماتے ہیں کہ "یہ بات واضح ہی ہے کہ اس ادارے کا مقصد اسلام کو دین برحق سمجھ کر اس کی ہدایات وتعلیمات سے استفادہ نہیں ہے، چناں چہ یہاں اساتذہ کی بیشتر تعداد غیر مسلموں پر مشتمل ہے، جنہوں نے اپنی تحقیق وجستجو کا موضوع اسلام اور مسلمانوں کو بنایا ہے اور وہ روزانہ اسلامی علوم کے سمندر میں غوطہ لگانے کے باوجود، اس سے اپنے ہونٹ بھی تر نہیں کر سکے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مغرب میں اسلام پر ریسرچ کرنے والے ان اداروں کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے، اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات کا بیج بونا، اور مسلمان ملکوں میں مغربی مفادات کا تحفظ کرنے والوں کو علمی ہتھیار فراہم کرنا ہے۔ اور اگر بہت زیادہ خوش گمانی سے کام لیا جائے تو "علم برائے علم" ہے۔

اور یہیں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ "علم برائے علم" جو محض "جاننے" کی حد تک محدود رہ کر "ماننے" اور "جھکنے" سے نا آشنا ہو، انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ ایسا علم کائنات میں سب سے زیادہ ابلیس کو حاصل ہے، لیکن وہ اسے "کفر" اور "جہنم" سے بھی نہیں بچا سکا۔ اور جو علم انسان کو اپنے خالق ومالک تک پہنچا کر اسے ایمان بھی نصیب نہ کر سکے، اس پر خواہ مرعوب کن ڈگریوں کا کیسا دلفریب خول چڑھا ہوا ہو، کارزار حیات میں وہ انسان کے کسی کام کا نہیں"۔ (جہان دیدہ، ص ۵۹۳)

مسلمانوں میں تعلیمی سیکولرائزیشن:

مسلمانوں میں سیکولرائزیشن کا آغاز تعلیم کے باب میں ۱۶۹۹ء کے بعد ہوا۔ پہلے

خلافت عثمانیہ میں پھر مصر میں اور اس کے بعد ہندوستان میں۔

کمال اتاترک کا خیال تھا کہ ترک اپنے ماضی سے کلی طور پر کٹ کر اپنا رشتہ مغربی تہذیب سے جوڑ لے تو ترکی، معاشی اور سیاسی ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کر سکے گا۔

(مفتی محمد تقی عثمانی)

اسی کا نتیجہ تھا کہ کمال اتاترک اور اس کے ساتھ مغربی تہذیب سے بری طرح مرعوب ذہنوں نے خلافت عثمانیہ پر ہی ہاتھ صاف کرنا ضروری سمجھا، یہاں تک کہ کمال اتاترک نے خلافت کو ختم کر کے ملک کو لادینی ریاست میں تبدیل کر دیا۔ اور اسلامی قانون اور شریعت کو ملک سے بے دخل کر کے وہاں سوئٹزرلینڈ کا دیوانی، اٹلی کا فوجداری، اور جرمنی کا تجارتی قانون نافذ کر دیا گیا۔ دینی تعلیم ممنوع قرار دے دی گئی، پردے کو خلاف قانون قرار دیا گیا، درسگاہوں میں مخلوط تعلیم کا سلسلہ شروع کیا گیا، عربی رسم الخط کے بجائے ترکی زبان کے لیے لاطینی رسم الخط کو لازمی قرار دیا گیا۔ عربی اذان دینے پر پابندی لگا دی گئی، قوم کا لباس تبدیل کر دیا گیا، ہیٹ کا استعمال لازمی کر دیا گیا، (اور اس غرض کے لیے ایک خونریز جنگ لڑی گئی، جس میں ترکوں کے سر پر ہیٹ رکھنے کے لیے نہ جانے کتنے سر اتارے گئے)۔

کمال اتاترک نے یہ تبدیلیاں اس خیال سے کی تھیں کہ ترک اپنے ماضی سے کلی طور پر کٹ کر اپنا رشتہ مغربی تہذیب سے جوڑ لیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح ترکی معاشی اور سیاسی ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کر سکے گا۔ اس نے مغربی تہذیب کے تمام اثرات کو نافذ کرنے کے لیے تعلیم اور ذرائع ابلاغ سے لیکر جبر و استبداد تک ہر طریقہ پورے جوش وخروش سے آزمایا ہے۔ لیکن اگر ترکی معاشرے پر اس (۷۰-۸۰ سال کے) انقلاب کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے تو واضح طور پر یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ بڑے شہروں کی حد تک یہ انقلاب عریانی و فحاشی کو یورپ کی سطح تک لانے اور لوگوں کا لباس اور رسم الخط بدلنے میں تو بے شک کامیاب رہا، لیکن جہاں تک ملک کے حقیقی مسائل کا تعلق ہے، ان میں اتاترک ذہنیت کی یہ طویل حکمرانی اسے کوئی قابل ذکر فائدہ نہ پہونچا سکی۔

(دنیا مرے آگے ص: ۱۳۲/۱۳۳)

سیکولر ملکوں میں بھی عام مسلمانوں اجتماعی ضمیر بہر حال اسلام پسند ہوتا ہے۔ مفتی محمد تقی عثمانی اسی ترکستان کا حال بیان فرماتے ہیں جہاں خواتین کے لیے پردہ جرم قرار دیا گیا

تھا۔" وہاں نوجوان طالبات پردے کا اہتمام کررہی ہیں۔ترکی کے ایک شہر سیواس کی ایک میڈیکل یونیورسٹی میں اس سال پہلی پوزیشن جس طالبہ نے حاصل کی، وہ پردہ کی پابند ہے۔ میرے ترکی پہنچنے سے چند روز پہلے اس یونیورسٹی کا جلسۂ تقسیم اسناد(Convocation) منعقد ہوا تھا۔ یونیورسٹی کی روایت کے مطابق پہلی پوزیشن حاصل کرنے والی طالبہ کواس اجتماع سے خطاب کرنا چاہیے تھالیکن یونیورسٹی کے سربراہ نے اس طالبہ کو پردے کی وجہ سے کنووکیشن میں مدعو نہیں کیا،اس کے باوجود وہ لڑکی پردے کی حالت میں ازخود اسٹیج تک پہنچ گئی اور مطالبہ کیا کہ اسے روایت کے مطابق خطاب کا موقع دیا جائے۔اس پر یونیورسٹی کے سربراہ نے غصہ میں آکر اس کے سر سے وہ مخصوص سرپوش اتار دیا جو اس موقع پر پہنا جاتا ہے، اتفاق سے یہ منظر ٹی وی پر دکھایا جارہا تھا، اور اسے دیکھ کر پورے ترکی میں آگ لگ گئی، ہر طرف سے مطالبہ شروع ہوا کہ یونیورسٹی کے اس سربراہ کو معزول کیا جائے، چناں چہ اس واقعہ کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر وہ معزول ہو چکا تھا۔اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ ازمیر (ترکی) میں بھی پیش آیا"۔ (دنیا میرے آگے ص/ ۱۳۵)۔۔۔لیکن سیکولرزم کے دلدادہ امت مسلمہ کے سیکولر افراد تو سیاسی اور حکومتی سطح پر کوئی بھی کسر اٹھا نہ رکھی تھی یہاں تک کہ ترکی میں جہاں اسلامی قانون اور عدل وانصاف کی وجہ سے مسیحی علاقوں کے باشندے ترک وطن کرکے سلیمان اعظم اور سلطان محمد فاتح کے ملک ترکستان میں آکر آباد ہوئے تھے، اسی ملک پر یہ دور بھی آیا کہ "کمال اتاترک نے قرآن کریم کا نسخہ شیخ الاسلام کے سر پر مار دیا تھا اور جہاں عربی زبان تو کجا، قرآن کریم کی تعلیم اور عربی زبان کی اذان تک ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔کمال اتاترک نے ہیٹ وار کے دوران یہ سمجھا تھا کہ ترک ٹوپی کی جگہ اس قوم کو ہیٹ پہنا کر اس کا دماغ بھی تبدیل کردے گا"۔ (جہان دیدہ،ص/ ۳۶۶۔ازمفتی محمد تقی عثمانی)

مصر میں یہودی جو کام ۱۷۹۷ء میں نپولین سے نہ کرواسکے وہ محمد علی سے زیادہ بڑے پیمانے پر کروالیا۔۱۸۱۴ء میں اس (محمد علی) سے یہودیوں نے وہی کام لیا جو ۱۷۹۳ء میں انگریزوں سے ہندوستان میں دوامی بندوبست کرواکر اور ۱۷۴۰ء۔۱۷۲۷ء میں اسٹالن سے روس میں Collectivization کرواکرلیا گیا۔۔۔ملک کو علمی اور فکری اعتبار سے سیکولرائز کرنے کی کوشش ۱۸۲۵ء سے شروع ہو چکی تھی۔۔۔اور سعید پاشا (۱۸۷۶ء تا ۱۸۸۲ء) کے دور سے سیکولرائزیشن کے عمل کو سرکاری ہی نہیں بل کہ عوام کی نچلی سطحوں تک

لاکر راسخ کرنے کی کوشش پوری ہوئی اور اس کے بعد تو یہ بھی ہوا کہ ۱۹۹۴ء میں قاہرہ نے عورتوں کی عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ (عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال ص/۲۵۴ تا ۲۵۵)

مسلمانوں کے اندر پیدا شدہ یہ سیکولر طبقہ مغرب پرستوں اور مستشرقین کے لیے نہایت درجہ کارآمد کیوں کہ "مغربی افکار کے استیلاء کے بعد اسی ملک کے بعض "دانشوروں" (سیکولر دماغوں۔ف) نے مغربیت کی نشر و اشاعت میں بھی بھر پور حصہ لیا، "مفتی محمد عبدہ"، "سید رشید رضا" ان کے بعد "طٰہٰ حسین" اور "احمد امین" جیسے متجددین اسی ملک میں پیدا ہوئے، جن کے افکار اور تحریروں نے پورے عالم اسلام کے تجدد پسند حلقے کو (علمی۔ف) اسلحے فراہم کیے"۔ (جہان دیدہ۔از مفتی محمد تقی عثمانی، ص ۱۶۲)

جمال عبدالناصر کے عہد میں دین کو عملاً جاری کرنے کی فکر کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ملک میں عربی قوم پرستی، بے دینی، عریانی، اور فحاشی کا ایک سیلاب امڈ آیا۔۔۔۔ذرائع ابلاغ کسی ادنیٰ رو رعایت کے بغیر علی الاعلان عریانی وفحاشی کی تبلیغ کرنے لگے۔ (ایضا، ص ۱۶۳)

الجزائر پر فرانس کا استعمار (جس کی ابتدا ۱۸۳۰ء سے ہوئی۔ف) عالم اسلام کا بدترین استعمار ثابت ہوا جس پر مسلمانوں کے لیے شخصی زندگی میں بھی دین پر عمل کرنا دوبھر بنا دیا گیا۔۔۔اسلامی علوم تو کجا، عربی زبان پر بھی پابندی لگائی گئی۔۔۔اس کے ساتھ ساتھ یورپ کی تمام اخلاقی بیماریاں درآمد کر کے یہاں پھیلائی گئیں۔ یہاں تک کہ بڑے شہروں میں مسلمان خواتین کے غیر مسلموں کے ساتھ نکاح کے بھی بہت سے واقعات ہوئے۔ جب زبردست جانی ومالی قربانیوں کے بعد ملک فرانسیسی سامراج کے تسلط سے آزاد ہوا تو عالم اسلام کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی استعمار کے طویل زمانے میں فرانسیسی سامراج ملک میں ایسے لوگوں کی پوری ایک نسل تیار کر چکا تھا جو سیاسی طور پر سامراج کے خواہ کتنے خلاف ہوں، لیکن نظری اور عملی لحاظ سے پوری طرح یورپ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور اسی کے ذہن سے سوچنے کے عادی تھے۔ (جہان دیدہ ص/۱۱۸)

حسین بے، شاکر اور احمد بے کی کوششوں کے پس پردہ الجزائر کو بھی اسی راہ پر لے جایا گیا جس پر مصر میں محمد علی، عباس، سعید، اسمٰعیل اور توفیق پاشا گئے تھے۔ محمد بے (۱۸۵۵ء تا ۱۸۵۹ء) محمد الصادق (۱۸۵۹ء تا ۱۸۸۲ء) اور خیر الدین پاشا کی سرپرستی میں سیکولرائزیشن کا عمل سختی کے ساتھ شروع کیا گیا۔۔۔۔تعلیم کی راہ سے سیکولرائزیشن کو آگے بڑھانے کی

متعدد اور مختلف النوع کوششیں ہوئیں۔(اخلاقی صورت حال ص/۲۵۷)

''انڈونیشیا کی تقریباً نوے فیصد آبادی مسلمان ہے اور باقی دس فیصد آبادی میں عیسائی، ہندو، بدھ، چینی وغیرہ ہیں''۔۔۔۔حکومت کے زیر انتظام چلنے والی دو اسلامی یونیورسٹیوں میں ''یہ دیکھ کر حیرت کے ساتھ افسوس ہوا کہ دونوں جگہ نظام تعلیم مخلوط ہے۔اس صورت حال سے خود یونیورسٹی کے بعض اساتذہ بھی ناخوش معلوم ہوتے تھے لیکن اپنی اس رنجیدگی کا علاج فی الحال ان کے بس میں نہیں''۔۔۔۔''جب احقر نے ایک یونیورسٹی کے ذمہ دارترین فرد سے پوچھا کہ ''اسلامی یونیورسٹی'' میں مخلوط تعلیم کا کیا جواز ہے؟ تو انہوں نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ حیرت بھرے لہجے میں کہا کہ ''یہ انڈونیشی اسلام ہے'' البتہ یہاں طالبات کا لباس کافی ستر پوش ہے جبکہ عام تعلیمی اداروں میں طالبات کا عام لباس اسکرٹ ہے''۔ (جہانِ دیدہ،ص/۲۸۰تا۲۸۱)

''علم شئ بہتر از جہل شئ''
کا بے ضرر اصول لیکن انضمام عوارض سے خطرناک نتائج

مسلمانوں کو نئے علوم کے سیکھنے سے انکار کبھی نہیں رہا بلکہ جو چیز انہیں متوحش کر رہی تھی اور کرتی رہی وہ ان کے تحت الشعور کا یہ احساس ہے کہ رفتہ رفتہ ان اقدامات کے ذریعہ ان کی حقیقت بدلی جارہی ہے۔(عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال:۲۵۲)۔۔۔۔اور ہوا بھی یہی کہ جدید تعلیم کے اثر سے رفتہ رفتہ مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر سیکولرائز ہوتا چلا گیا۔ علی مسعود کے مطابق مسلمانوں کے سیکولرائزیشن میں مؤثر رول ادا کرنے والا ایک اہم عنصر مغربی تہذیب،ثقافت اور اداروں سے مسلمانوں کے ربط قائم ہونے کا تھا۔تقریباً دنیا کے ہر مسلم خطے میں کم بیش ایسے افراد کا ظہور ہوا جو خود عالم اسلامی میں اس سیکولرائزیشن کے علمبردار ہوگئے۔(اخلاقی صورت حال ص ۲۸۶) سر سید ہوں یا ڈپٹی نذیر احمد دجل کے حجابات کو ہٹانے کے بجائے اس کے شکار ہوتے چلے گئے۔۔۔۔دوڑ دوڑ کر اسی راہ کی طرف لپکتے رہے جہاں دشمن نے کمیں گاہیں بنا رکھی تھیں۔۔۔۔سر سید یقیناً نذیر احمد سے بہت زیادہ ذہین تھے۔

لیکن ان کی سوچ ترکی قمیص اور بند گلے کے کوٹ سے اوپر نہ جاسکی۔

پوری دنیا میں سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے عالم اسلام میں اسلام کے تناظر میں سیکولرزم کی نظریہ سازی (conceptualize) کی سیکولرائزیشن کی عملی کوششوں کو علمی اور فکری اظہار بیان دیا۔ ان کا قول: ہمارے داہنے ہاتھ میں قرآن ہوگا اور بائیں ہاتھ میں سائنس اور سر پر کلمہ طیبہ کا تاج'' سیکولرائزیشن کی اپنے دور میں عدیم النظیر نظریہ سازی تھی۔

(اخلاقی صورت ص ۲۵۱)

اور اکبر الہ آبادی کی یہ بات بھی کہ تہذیب بدل جائے گی تعلیم بدل جانے سے۔ کوئی نظری مسلہ نہیں رہ گیا، بل کہ بدیہی اور مشاہداتی واقعہ بن گیا، تہذیب بدل گئی، دل بدل گیے۔ وہ تہذیب جسے مسلم یا اسلامی تہذیب کہتے ہیں اس کے خاتمہ کے آغاز کے متعلق ہوٹنگر لکھتا ہے کہ ''مسلم تہذیب کے خاتمہ کا آغاز اٹھارھویں صدی میں اس وقت شروع ہوا جب عالم اسلام میں مغربیت کا ظہور ہوا۔ (اخلاقی صورت حال: ص ۲۸۱) ۔۔۔ وہ بیج جو بالآخر اس ثقافتی قوم کو درہم برہم کرنے والا تھا ''یوروپیانا ئزیشن'' (Europeanization) کے ذریعہ بویا گیا۔ اور اس کا طاقتور عنصر سرسید احمد خاں کی قدآور شخصیت تھا۔

لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ یہ استعماری تغلب اور اندرونی طور پر امت میں ظہور پذیر سیکولرائزڈ طبقات کے باوجود روح اسلام نے اسے کبھی بھی قبول نہیں کیا، یہی کشمکش ہنوز جاری رہی۔ تاریخی طور پر اس کا اظہار فلپ ہٹی نے بھی کیا ہے:

مشہور تاریخ داں فلپ ہٹی (Philip k. Hitti) نے لکھا ہے کہ جیسے ہی ماڈرنائزیشن کے مدوجزر کی لہریں جو ایک عالمی صورت حال تھی بحر متوسط کے جنوبی اور مشرقی ساحلوں پر حملہ آور ہوئیں بیشتر سیاسی معاشی، معاشرتی اور تعلیمی ادارے ہوا ہو گئے۔ صرف مذہبی اور دینی ادارے اس طوفان کو جھیل کر زندہ رہنے میں کامیاب رہے کسی ماڈرن مسلمان مفکر نے جو موقر سمجھا جاتا ہو کم از کم اب تک علانیہ طور پر خدا کی وحدانیت یعنی توحید، محمد کی رسالت، قرآن کے تقدس، روح کے جاودانی ہونے یا زندگی بعد موت کو چیلنج نہیں کیا۔۔۔

(ص/ ۲۸۹-۲۹۰)

سیکولرائزیشن کے اس تناظر میں بددینی سے بچانے کا کیا طریقہ ہو؟ پیچھے گذر چکا کہ ایک طریقہ یہ ہے کہ ''مسلمان تعلیمی ادارے خود قائم کرے اور بچوں کو ابتدا ہی سے دینی

ماحول فراہم کیا جائے یہ مسلمانوں کی موت اور زندگی کا مسئلہ ہے"۔ اور زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ جنہیں قوت توکل حاصل ہو، قناعت اور استقامت کے ساتھ دین سے وابستہ ہوں انہیں تو اپنے بچوں کے اندر قناعت اور دین میں استقامت جیسے اخلاق واوصاف کی تربیت کے ساتھ دینی تعلیم میں ہی لگانا چاہیے، کیوں کہ برائیوں سے بچانے والی دو ہی چیزیں ہیں: عقل اور علم دین نہ کہ سیکولر تعلیم۔

اب یہاں پر حضرت حکیم الامتؒ کی پیش کی ہوئی ایک حکایت ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے حضرت مولانا عیسیٰ صاحب الہ آبادی قدس سرہٗ بیان فرماتے ہیں کہ:

"حضرت (حکیم الامتؒ) کے ایک عزیز ہیں جو واعظ ہیں۔ انہوں نے اپنے لڑکوں کو انگریزی پڑھائی ہے۔ حضرت ان سے بہت ناراض ہیں۔ حضرت نے ان کو منع کر دیا ہے کہ میرے پاس خط نہ بھیجا کرو"۔

فرمایا کہ انہوں نے اس بات کو گوارا کر لیا انگریزی پڑھانا نہ چھوڑا۔ فرمایا کہ میں نے کہا کہ شرم نہیں آتی وعظ کہتے ہو اور انگریزی اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو اگر مولوی نہ ہوتے تو اتنا ناگوار نہ ہوتا، اب کیا منہ رہا منبر پر بیٹھ کر دین کی ترغیب دینے کا۔ انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ لڑکے کم عقل ہیں، اس لیے علم دین پڑھانے کے قابل نہ تھے۔ میں نے کہا "سبحان اللہ" اس صورت میں تو ان کو علم دین پڑھانا اور بھی ضروری تھا کیوں کہ اگر کم عقل نہ ہوتے تو ان کے بگڑنے کا اندیشہ نہ تھا۔ عقل ان کو برائیوں سے روکے رہتی۔ اب جب کہ عقل بھی نہیں اور علم دین نہ ہوگا تو کیا چیز ان کے پاس رہی جو شر اور فتنوں سے محفوظ رکھ سکے، یہی دو چیزیں ہیں جن کے ذریعے سے آدمی برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ اس کا ان سے کچھ جواب نہ بن سکا۔ (کمالات اشرفیہ: ج ۲۳/ص ۴۶۸)

مسلم ممالک:

لیکن اس کا کیا کیجئے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ سیکولر تعلیم اور سیکولرزم کے شوق میں اسلامی علوم کو ہی بے فائدہ سمجھتا ہے:

چند مسلم ممالک کا جائزہ پیش کرتے ہوئے یمن کے سفر کے حالات میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

۔۔۔برصغیر کے دینی مدارس کی طرح کے پرائیوٹ تعلیمی اداروں کا تصور اب عرب ملکوں میں مفقود سا ہو چکا ہے۔ سرکاری یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں سے ہٹ کر دینی تعلیم کا کوئی قابل ذکر ادارہ ان ملکوں میں نہیں پایا جاتا لیکن جامعۃ الایمان، میری معلومات کی حد تک عرب ممالک میں یونیورسٹی کی سطح کا واحد تعلیمی ادارہ ہے جو سرکاری یونیورسٹی نہ ہونے کے باوجود اتنے بڑے پیمانے پر دینی تعلیم کے لیے قائم ہے۔۔۔شیخ یوسف القرضاوی نے جامعۃ الایمان کے پہلے تقسیم اسناد (اجازت) کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے ان لوگوں کی پر زور تردید کی جو سیکولرزم کے شوق میں اسلامی علوم کی تعلیم کو بے فائدہ سمجھتے اور ایسے اداروں کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ (دنیا میرے آگے: ص ۲۵۲)

یمن میں جب سے جمہوری حکومت قائم ہوئی ہے، اس کا میلان مغرب کی طرف رہتا ہے، عالم اسلام کے دوسروں ملکوں کی طرح یہاں بھی عوام اور حکام کے درمیان مفاہمت کے بجائے بُعد کی ایک خلیج حائل ہے جس کا تمام تر فائدہ دشمنان اسلام کو پہنچ رہا ہے، اور ملک کے بہترین وسائل امت کی فلاح و بہبود کے بجائے دوسرے کے مقاصد پورے کرنے کے کام آرہے ہیں، اللہ تعالی ہمارے نامۂ اعمال کو اپنے فضل و کرم سے دور فرما کر اس مہلک صورت حال سے ہمیں نجات عطا فرمائیں تو عالم اسلام آج دنیا بھر کی قیادت کے مقام پر ہو۔
(دنیا میرے آگے ص ۲۶۹ جولائی ۲۰۰۱) ص نمبر ۱۴)

سیکولر تعلیم کے اہداف و مقاصد:

جرجن ہمبرمس (jurgen Hambermas) کے بقول سیکولرائزیشن کے دورِ حاضر میں تین اہداف مقرر کیئے گئے ہیں:

(۱) جامعات کا ڈیماکریٹائزیشن (Democratization of Univercities)

(۲) سیاست کا سائنٹائزیشن (cientization of Politics)

(۳) ٹیکنالوجی اور سائنس بطور فکر (Technology and science as ideology)

(۱) جامعات کا ڈیماکریٹائزیشن سے مراد سارے تعلیمی نظام کو عوامی، عملی اور غیر علمی بنا دینا۔۔۔یہ ایک ایسی صورت ہے جس کا تصوراتی اندازہ لگانا بھی اس وقت دشوار ہوگا۔ ظاہر ہے جس معاشرے میں اس کا صدفی صد انطباقات و نفاذ ہو جائے گا وہاں علم اور معلوم کی کمترین اور پایاب صرف وہ صورت باقی رہ جائے گی، جہاں انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کی

اعلیٰ سطح پر ہوتے ہوئے، اپنے علم ومعلوم کے اعتبار سے ایک ان پڑھ اور بے علم انسان کی طرح ہوگا۔ (اخلاقی صرورت حال، ص۲۷۹)

معقولات، وجدانات اور ملکات کوترک کر کے محسوسات کے ترکیب دینے اور تحلیل وتجزیہ میں عمر کھپانے کی، نیز مقاصد کو پس پشت ڈال کر ذرائع اور وسائل کو مقاصد کا درجہ دے دینے کی یہ ایک عبرت ناک سزا معلوم ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے قریب علم گھٹتا جائے گا۔ ظاہر ہے جس علم کے گھٹنے کی بات کہی گئی ہے وہی اصل علم ہے اور وہ، وہ علم ہے جس سے روح کی ترقی وابستہ ہے۔ انسان کی پیدائش کا مقصد اصلی یہی روح کی ترقی ہے کہ مادی اشیاء اور مادی جسم سے وابستہ ہونے کے باوجود یہ روح مادہ کی کثافتوں سے اپنے آپ کو آلودہ نہ ہونے دے بل کہ ملکات فاضلہ کے ذریعہ اپنی لطافت میں اضافہ کرتی جائے کہ بصیر ولطیف ذات خالق کائنات سے اسے مناسبت اور قرب حاصل ہوجائے۔

لیکن جن معلومات وتحقیقات کی بنیاد یہ نظریہ ہو کہ حیات وکائنات کی اصل مادہ ہے، مادہ کے علاوہ اس میں کچھ بھی نہیں کوئی علیم وخبیر ذات نہیں اور نہ کوئی بالاتر ہستی جس کے رضاوقرب کی تحصیل اور جس کے احکام کی پابندی انسان کے ذمہ لازم ہو۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ سے وابستہ لوگ اصل علم سے غافل اور دور ہوتے جائیں گے اور جیسے جیسے اس مادہ کے ساتھ شغف وانہماک بڑھتا جائے گا اصل علم سے غفلت اور جہالت میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ ''اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ لَجَهْلًا '' کے بالکل مشاہداتی حالات کہ معلومات بھی بڑھتی جارہی ہیں لیکن اُس سے خشیت حق حاصل ہونے کے بجائے عناد وسرکشی میں ہی اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے جو کہ ظلمت وجہالت کا ثمرہ ہے، بڑھتی جائے۔

(۳) ٹیکنالوجی اور سائنس بطور فکر: میکس ویبر کے مطابق لوگوں کی فکر کو کلی طریقے سے تعقلی بنادینا، یہاں تک کہ وہ اپنی اعتقادی، عقائدی دنیا میں صدفی صد سائنسی اور ٹیکنیکی ہوجائیں۔ تعقلی (Rationalization) کا مطلب ہے سب سے پہلے معاشرے کے دائرہ کار کو تعقلی فیصلے (Rational Dicision) کی میزان کے تابع بنادینا۔۔۔

(اخلاقی صورتحال ص۲۷۹، ۲۸۰)

پروفیسر اگوائی کے مطابق تقریباً چالیس سالوں سے زیادہ عرصے سے (۱۹۹۷ء میں یہ بات کہی جارہی ہے۔ف) تعلیمی ترقی، معاشرتی، معاشی ترقی اور اپنے اپنے معاشرے کی

عام ترقی کے اعتبار سے تعلیم تین اہم خصوصیات کی حامل ہوگئی:

(۱) سیکولرائزیشن: جیسا کہ گذشتہ اوراق میں کیے گئے متعدد ملکوں میں تعلیم کے باب میں سیکولرائزیشن کی کوششوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) فارملائزیشن: جونتیجہ ہے توسیع کی ضرورت نصاب کی ترقی اور معیاری بنانے کا۔

(۳) یونیورلائزیشن: بطور خاص ابتدائی اور پرائمری اسکول کی سطح پر جہاں اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ تعلیم کے ذریعہ یکساں مواقع پیدا کئے جائیں۔

(عالم اسلام کی اخلاقی صورتحال: ص ۲۸۸ ـ ۲۸۷)

تعلمی سیکولرائزیشن کا مقصود اور ماحصل:

مارگریٹ میڈ (Margaret Mead) نے تین طرح کا معاشرہ کا تصور کیا۔

(۱) مابعد مرادی (Post Figurative) وہ معاشرہ جہاں بچے اسلاف سے علم حاصل سیکھتے ہیں۔

(۲) ہم مرادی (Cofigarative) وہ معاشرہ جہاں بچے اور ان کے بڑے دونوں بیک وقت موجود بڑوں سے علم حاصل کرتے ہیں۔

(۳) ماقبل مرادی (Prefigurative) وہ معاشرہ جہاں بڑے اور عمر دراز لوگ بچوں سے علم سیکھتے ہیں۔

سیکولرائزیشن کا مقصد معاشرے کو ماقبل مرادی معاشرہ میں تبدیل کر دینا ہے، چناں چہ میڈ (Margaret mead) کے مطابق مغرب کا یورپی معاشرہ، فی الواقع اب ماقبل مرادی معاشرہ بن چکا ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ، صحابہ میں ''حکیم الامت'' کا لقب رکھتے تھے، ان سے صحابہ کرام رضوان اللہ عنہم درخواست کیا کرتے تھے ''اجلسوا بنا نؤمن من ساعة'' یعنی تھوڑی دیر ہمارے ساتھ بیٹھیے تا کہ ہم ایمان تازہ کرلیں۔ جب یہ خیار الخلائق اس قسم کے مذاکروں اور مجلسوں سے بے نیاز نہیں تھے تو اندازہ کیجئے کہ ہماری احتیاج اس کی طرف کتنی زیادہ ہوگی۔ مگر افسوس ہے کہ ہم اسی ضرورت سے غافل ہیں۔

انسانیت کا سکون نہ اشتراکی نظام میں ہے نہ سیکولرزم میں

اشتراکی نظام کیوں پیدا ہوا!

حکیم فخر الاسلام الٰہ آبادی

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ النبی الأمین ۰

دولت مندی کے عین درمیان افلاس (Powerty in the midst of plenty)نے اشتراکیت کو جنم دیا تھا۔

بورلے ہلز (BeverlyHills) لاس اینجلیز کا وہ محلّہ ہے جس میں دنیا کے امیر ترین افراد آباد ہیں اسی محلّہ کی ایک سڑک دنیا کی سب سے مہنگی مارکیٹ کہلاتی ہے۔۔۔ یہاں ہر چیز غیر معمولی طور پر مہنگی ہے۔۔۔ایک دوکان کے مالک اپنے گاہکوں کو سوٹ کے انتخاب اور اس کے رنگ اور ڈیزائن کے تعین کے لے مشورے بھی دیتے ہیں اور اس مشورے کے بھی ہزاروں ڈالر چارج کرتے ہیں۔ مشورہ حاصل کرنے کے لیے ان سے پہلے وقت لینا پڑتا ہے اور وقت بھی آسانی سے نہیں ملتا بل کہ بعض اوقات مہینوں بعد ان سے شرف باریابی حاصل کرنے کا نمبر آتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ سڑک دولت کے تالاب رکھنے والوں کے لیے اپنی دولت کا اظہار اور اس کے خرچ کے بہانے ڈھونڈنے کا ایسا ذریعہ ہے جس کے لیے اعلیٰ سطحی حماقت کے سوا کوئی اور لفظ مجھے نہیں مل رہا۔۔۔

لیکن یہاں سے چند ہی فرلانگ کے فاصلے پر سر بہ فلک عمارتوں کے نیچے فٹ پاتھ پر ایسے لوگوں کی ایک اچھی خاص تعداد نظر آئیگی جو سڑکوں پر رکھے ہوئے کچرے کے بکسوں سے کوکا کولا، سیون اپ وغیرہ کے خالی ڈبے جمع کر رہے ہوں گے۔ رات بھر یہ ڈبہ جمع کر کے وہ صبح کو انہیں کسی کباڑیے کے پاس فروخت کرتے ہیں اور اس کی قیمت پر اپنی گذر اوقات کرتے ہیں۔ انہیں فٹ پاتھوں پر متعدد لوگ ایسے نظر آئے جو ایک ٹرالی میں پھٹا پرانا سامان رکھے ہوئے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہی ٹرالی ان کا گھر ہے، اور اس میں رکھا ہوا سامان

ان کا کل اثاثہ ہے۔ جب سونے کا وقت آتا ہے تو وہ اسی ٹرالی کو کہیں کھڑا کر کے اس کے سائے میں سو جاتا ہے۔ انہیں فٹ پاتھوں پر بہت سے لوگ بھیک مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عامر صاحب نے ایک پٹرول پمپ پر گاڑی روکی تو ایک سفید فام بھکاری نے ان سے بھیک مانگی۔ ان کے پاس اس وقت ڈالر کے چھوٹے نوٹ نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے معذرت کرنی چاہی اس پر بھکاری نے کہا (Itake Pennies) یعنی میں پیسے بھی لے لیتا ہوں۔ چناں چہ انہوں نے چند سکے اسے دیے اور وہ راضی ہو کر چلا گیا۔

''دولت مندی کے عین درمیان افلاس (Poverty in the Midstofplenty) کی یہی وہ فضا ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے۔ اسی کے ردعمل کے طور پر اشتراکیت نے جنم لیا تھا۔ آج اگر اشتراکیت اپنی ذاتی کمزوریوں کی بنا پر شکست کھا گئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں دور ہو گئی ہیں. یہ خرابیاں آج بھی برقرار ہیں اور جب تک حقیقت پسندی کے ساتھ انہیں دور نہیں کیا جائے گا، انسانیت افراط وتفریط کی انتہاؤں میں بھٹکتی رہے گی۔ (دنیا مرے آگے: ص ۱۶۱، ۱۶۲)

اشتراکی نظام:

(۱) اشتراکی نظام کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چوں کہ تمام وسائل پیداوار حکومت کے کنٹرول میں آجاتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ حکومت سرکاری ملازمین ہی کے ذریعہ چلائی جاتی ہے، اس لیے سرکاری ملازمین کی بدعنوانیوں اور ان کی مطلق العنانی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۲) دوسری طرف کمیون سسٹم کے مذکورہ بالا طریق کار میں پیداوار بڑھانے کے لیے کما حقہ محنت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔

(۳) تیسری طرف صنعتی پیداوار پر بھی ذاتی منافع کے محرک کے فقدان کی بنا پر مضر اثر مرتب ہوتا ہے اس لیے حقیقی پیداوار منصوبہ بندی کا ساتھ نہیں دیتی۔

(۴) چوتھے جن کاشتکاروں کو ابتدا میں یہ سبز باغ دکھایا جاتا ہے کہ ملک کی ساری زمینیں تمہاری ملکیت ہو جائیں گی، جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ عملاً وہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی ملکیت سے بھی محروم ہو گیے ہیں، اور اب ان کی آمدنی کا تمام تر تعین حکومت کے ہاتھ میں ہے، جو سرکاری ملازمین کے توسط سے بدعنوانیوں کا ارتکاب بھی کرتی ہے تو ان کے درمیان اس نظام

کے خلاف مزاحمت کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔(جہان دیدہ،ص۴۵۶)

چین میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت کے بعد یہاں ''ثقافتی انقلاب'' کے نام سے جو تحریک چلی، اس میں مذہب کے خلاف بڑی سختیاں کی گئیں۔ مسلمانوں کی مسجدیں بند کردی گئیں، تعلیمی ادارے ختم کردیے گئے اور اسلامی شعائر کو مٹانے کی پوری کوشش کی گئی۔

(جہان دیدہ،ص۴۰۰)

ماؤزے تنگ نے برسر اقتدار آنے (۱۹۴۹ء) کے بعد سے اپنی وفات (۱۹۷۸ء) تک ملک میں ٹھیٹھ اشتراکی نظام زندگی قائم کرنے (کمیونسٹ انقلاب۔ف) کے لیے قولی اور عملی کوشش میں کوئی دقیقہ خرو گزاشت نہیں کیا۔ چناں چہ تعلیم و تبلیغ اور تعمیر ذہن لے لیکر جبر و تشدد تک کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے، جو ماؤزے تنگ اور اس کے ہم خیال رفقاء نے چین میں نہ آزمایا ہو۔(جہاں دیدہ،ص۴۰۰)

''ثقافتی انقلاب'' کی تحریک چار پرانی چیزوں (پرانے نظریات، پرانی ثقافت، پرانے رسم و رواج، اور پرانی عادتوں) کے خلاف تحریک چلائی گئی اور یہ قرارداد ۱۹۶۶ء میں کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں مرکزی کمیٹی کے گیارھویں اجلاس میں منظور کی گئی۔

(جہان دیدہ،ص۴۵۷)

تمام مذہبی سرگرمیاں ممنوع قرار دیدی گئیں۔۔۔ مذہبی کتابوں کا گھر میں رکھنا جرم قرار پایا اور جو لوگ گھروں کی تلاشی کا وسیع اختیار لے کر گھر گھر گھوم رہے تھے انھیں اگر کسی گھر میں قرآن شریف کے ایک نسخے کا بھی سراغ لگ گیا تو بعض جگہ پورے خاندان کو تباہ کرڈالا۔۔ پیداوار تشویش ناک حد تک گھٹ گئی یہاں تک کہ اشیاء خورد و نوش کی قلت ایک دردسر بن گئی ایک پاؤ گوشت بازار سے خریدنے کے لیے بھی سرکاری کوپن ضروری تھا اور یہ کوپن لے کر بھی لمبی لمبی قطاروں میں لگنے کے بعد پاؤ بھر گوشت ملتا تھا۔(جہان دیدہ،ص۴۵۸)

''ثقافتی انقلاب'' جن وجوہ کی بناء پر اس قدر تباہ کن ثابت ہوا۔ ان میں ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے ایک گروہ کو ثقافتی انقلاب کے دوران جو قوت حاصل ہو گئی تھی اس کو اس نے پارٹی اور ملک دونوں کے اقتدار اعلی پر قبضہ کرنے کے لیے استعمال کیا اور اس غرض کے لیے ہر قانونی اور غیر قانونی، اخلاقی اور غیر اخلاقی طریقہ استعمال کیا۔

(جہان دیدہ،ص۴۶۲)

۱۹۸۲ء میں کمیونسٹ پارٹی کی بارہویں کانگریس میں چین کے سیاسی معاشی نظام میں بڑی انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں دستور میں دہریت کی طرف جو میلان تھا اسے ختم کر کے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی کی تاکید کی گئی، ملک بھر میں ۵۴ہزار سے زائد جو کمیون قائم تھے کمیون سسٹم جس میں زراعت کی پیداوار کا ۲۰ فیصد حصہ کام کرنے والے افراد کو ان کے کام کے حساب سے دیا جاتا، کچھ حصہ حکومت کو جاتا اور باقی پیداوار کا ۸۰ فیصد کمیون کی ملکیت ہوتا، جس سے علاقے کے ترقیاتی کام بھی کئے جاتے اور اسے کمیونوں میں بطور اجرت تقسیم بھی کیا جاتا، ان سب کو ختم کر کے اجتماعی ذمہ داری (Collective Responsilibity) کا ایک نیا نظام جاری کیا گیا، اس نظام کے تحت دیہات کے ہر کنبے کو اس کے افراد خاندان کے لحاظ سے ایک قطعہ زمین کاشت کے لیے دے دیا جاتا ہے، حکومت پیداوار کا ایک معین ہدف (مقدار کے لحاظ سے) مقرر کر دیتی ہے کہ اتنی مقدار حکومت کو دینی ہوگی۔ اس کے بعد باقی پیداوار کاشت کاروں کی اپنی ملک سمجھی جاتی ہے۔ جسے وہ اپنی مرضی سے فروخت کر کے نفع کما سکتے ہیں۔ گویا اب حکومت اور کاشت کار کا رشتہ زمیندار اور مزارع کا سا ہے۔ حکومت زمیندار ہے اور کاشت کار مزارع فرق یہ ہے کہ ہمارے نظام مزارعت میں (دونوں فریقوں کا حق متناسب حصوں) تہائی یا چوتھائی یا نصف) کی شکل میں مقرر ہوتا ہے۔ وہاں حکومت نے اپنا حصہ ایک معین مقدار کی شکل میں طے کر رکھا ہے (جو فقہ اسلامی کے تحت مزارعت کی فاسد صورت ہوتی ہے)۔ (جہان دیدہ، ص ۴۶۳)

جون ۱۹۸۴ء میں تمام صنعتوں کو بھی نفع نقصان کا ذمہ دار بنا دیا گیا اور حکومت کو صرف ٹیکس دینا ہوتا ہے۔ (ص ۴۶۴)

وہ ٹھیٹھ اشتراکی تصورات جن کو روایتی طور پر اشتراکیت کے بنیادی پتھر کہا اور سمجھا جاتا تھا چین میں ان کا عملی تجربہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ (ص ۴۶۵)

سیکولرزم:

سیکولرزم کے دو معنی ہیں:

(۱) مذہب سے آزادی۔ یعنی کوئی کسی بھی مذہب کو نہ ماننا چاہے اس پر کوئی کوئی قدغن نہیں۔

(۲) مذہب کی آزادی یعنی کوئی شخص مذہب اور مذہبی تعلیمات پر عمل کرنا چاہے تو اس پر

کوئی پابندی اور رکاوٹ نہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جس مذہب میں معاشی، معاشرتی اور سماجی اور سیاسی حالات میں بھی مذہبی احکام ہیں اور اس مذہب کا پیروان احکام پر عمل کرنا چاہے تو سیکولرزم تو رکاوٹ بنتا ہے۔ تو اب اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ سیکولرزم انسانی زندگی کے دو پہلوؤں کو فرض کرتا ہے ایک مقدس پہلو جس کا تعلق انسان کی روحانی زندگی سے ہے اور یہ انسان کا شخصی معاملہ ہے کہ کون کیا عقیدہ رکھتا ہے اور کس چیز کی عبادت کرتا اور ریاضت یوگ اور تپسیا کا کیا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

اور دوسرا سیکولر پہلو جس کا تعلق اس شخصی معاملہ سے آگے اجتماعی حالات سے ہے۔ جس میں معاشی، معاشرتی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی حالات پیش آتے ہیں۔ اس تناظر میں انسان اپنے مذہبی احکام پر عمل نہیں کرسکتا، بل کہ اس پہلو کی نگرانی دوسرے ادارے کرتے ہیں جس میں ریاست کو اہم ترین مقام حاصل ہے۔

سیکولرزم ایک طرف تو اپنی ماہیت اور حقیقت کے اعتبار سے اسلام کے ساتھ قائم نہیں رہ پاتا، دوسری طرف آزادی اور حقوق وفرائض کی ادائیگی کا خواہ کتنا ہی نام لیا جائے، لیکن مسلمانوں کے لیے تنگی، ظلم وجور، مذہبی عمل میں رکاوٹ ہی اس کا ہدف ہوتا ہے۔

مختلف غیر مسلم سیکولر ممالک میں مسلمانوں کی حالت: آسٹریلیا:

۲ر کروڑ والے سیکولر ملک میں مسلمانوں کی آبادی پانچ لاکھ لیکن وہ نکاح وطلاق وغیرہ کے فیصلے اپنے مذہب کے مطابق انجام نہیں دے سکتے: یہ صورت حال آسٹریلیا کی ہے۔ آسٹریلیا (جیسے ملک) میں مسلمانوں کا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ابھی تک نکاح، طلاق اور وراثت کے بارے میں ان کا پرسنل لاء ان ملکوں میں منظور شدہ نہیں ہے، جسکے نتیجے میں بہت سے خاندان شدید پیچیدگیوں کا شکار ہیں۔ ہمارے ملک (پاکستان) میں (اور ایسے ہی ہندوستان میں۔ف) تقریباً ہر مسلک کے لوگوں کا پرسنل لاء منظور شدہ ہے اور جن مذاہب کے لوگ بہت قلیل تعداد میں ہیں، ان کے نکاح وطلاق وغیرہ کے فیصلے انہی کے مذہب کے مطابق ہوتے ہیں، لیکن یہ ممالک جو اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہیں اور اپنے آپ کو مذہبی آزادی کا علمبردار قرار دیتے ہیں، وہ اپنے باشندوں کی اتنی بڑی تعداد کو ابھی تک یہ حق دینے کے لیے

تیار نہیں ہوئے، کہ ان کے نکاح وطلاق اور وراثت کے فیصلے ان کے مذہب کے مطابق انجام دیئے جائیں۔ میں نے آسٹریلیا کے بعض با اثر مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنی حکومت کو اس ضرورت کی طرف توجہ دلائیں اور جس طرح ماریشس اور ہندوستان وغیرہ میں مسلمانوں کا پرسنل لاء منظور شدہ ہے اس طرح یہاں بھی اسے منظور کرایا جائے۔ (ربیع الاول ۱۴۲۱ھ، مفتی تقی عثانی) ۔۔۔اس سلسلہ میں کچھ ابتدائی کارروائی شروع بھی ہوگئی ہے۔

(دنیا مرے آگے، ص ۲۱۷، ۲۱۸)

جنوبی افریقہ:

جنوبی افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کے داخلے کی داستاں بھی بڑی پر اثر ہے، جنوبی افریقہ کی اصل آبادی سیاہ فام قبائل پر مشتمل تھی، سترہویں صدی عیسوی میں ہالینڈ کی ڈچ قوم نے ایک طرف تو جنوبی افریقہ پر اپنا تسلط جمایا، اور دوسری طرف اسی زمانہ میں ملایا اور اس کے قرب وجوار کے جزیروں کو بھی اپنے استعمار کے شکنجے میں کس لیا، ملایا اور اس کے قریبی جزیروں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور وہاں بار بار جہاد آزادی کی تحریکیں اٹھتی رہتی تھیں۔ان تحریکوں کو ڈچ قوم نے ہمیشہ اپنی عادت کے مطابق جبر وتشدّد کے ذریعہ دبایا، اور وہاں کے بہت سے مسلمان مجاہدین کو گرفتار کرکے غلام بنالیا، پھر انکو جلاوطن کرکے کیپ ٹاؤن اپنے وطن سے ہزاروں میل دور بھیج دیا۔کیپ ٹاؤن میں ملایا کے ان مسلمانوں سے بڑی پر مشقت خدمتیں لی جاتیں۔ انہیں اپنے دین سے منحرف کرنے اور ان کی نسلوں کو ایمان کے نور سے محروم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، نماز تو کجا ان ڈچ آقاؤں کی طرف سے انہیں کلمہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی شخص نماز پڑھنے یا کسی اور عبادت میں مشغول ہونے کی جسارت کرتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔

۔۔۔ظلم واستبداد کی چکی میں پسنے کے باوجود انھوں نے اپنے دین کو سینے سے لگائے رکھا اور شدید مجبوری کی اس حالت میں بھی انھوں نے نماز تک کو نہیں چھوڑا۔ دن بھر محنت ومشقت کے کام کرنے کے بعد یہ اولوالعزم مجاہدین جب رات کو اپنی قیام گاہوں پر پہنچتے تو تھکن سے نڈھال ہونے کے باوجود اپنے نگرانوں کے سونے کا انتظار کرتے رہتے، اور جب وہ سوجاتے تو رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر اپنی قیام گاہوں سے نکلتے اور ایک پہاڑی پر چڑھ کر وہاں دن بھر کی نمازیں ایک ساتھ ادا کرتے تھے۔۔۔

تقریباً اسّی سال اللہ کے یہ بندے غلامی کی زنجیروں میں اسی طرح جکڑے رہے۔ بالآخر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ برطانیہ کے گوروں نے کیپ ٹاؤن پر حملہ کر کے یہ علاقہ ڈچ قوم سے چھیننا چاہا۔ اب ڈچ حکمرانوں کو ان انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے۔۔۔۔ اور جان کی قربانی دینے کے لیے ان غریب الوطن مسلمانوں سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں ہو سکتا چناں چہ ڈچ حکومت نے ان مجبور و مقہور مسلمانوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس جنگ میں ڈچ حکومت کا نہ صرف ساتھ دیں بل کہ انگریزوں کے مقابلہ میں اس کے ہراول دستے (بالکل آگے رہنے والا فوجی دستہ) کا کردار ادا کریں۔

اس مرحلہ پر ان مسلمانوں کو پہلی بار موقع ملا کہ وہ ڈچ حکومت سے کوئی مراعات حاصل کر سکیں۔۔۔۔ انہوں نے ڈچ آقاؤں سے کہا کہ اگرچہ ہمارے لیے انگریزوں اور ڈچ حکمرانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں لیکن ہم آپ کی خاطر انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ ایک صورت میں پیش کر سکتے ہیں اور وہ یہ کہ اس جنگ کے اختتام پر ہمیں کیپ ٹاؤن میں ایک مسجد تعمیر کرنے اور اس میں باجماعت نماز ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔ ڈچ حکمراؤں نے یہ شرط منظور کر لی اور اس طرح انہوں نے اپنی جان دے کر یہاں ایک مسجد بنانے کی اجازت حاصل کی۔ یہ جنوبی افریقہ میں پہلی مسجد تھی جو ان مجبور و مقہور ملائی مسلمانوں نے تعمیر کی۔ (دنیا مرے آگے، ص ۹۹ تا ۱۰۱)

مسلم سیکولر ممالک اور مسلمانوں کی دینی حالت۔ سیکولر ذہن کے حکمرانوں کی کیفیت:

انڈونیشیا:

"انڈونیشیا کی تقریبا نوے فیصد آبادی مسلمان ہے اور باقی دس فیصد آبادی میں عیسائی، ہندو، بدھ، چینی وغیرہ ہیں" ولندیزی حکومت کے خلاف آزادی حاصل کرنے کے بعد یہاں اسلامی حکومت کی داعی اور سیکولرزم کی علمبردار جماعتوں میں آویزش شروع ہوگئی۔ جب کمیونسٹ پارٹی نے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ تو موجودہ حکومت نے کمیونسٹوں کے مقابلے کے لیے تو اسلامی جماعتوں کا بھی تعاون حاصل کیا لیکن جب کمیونسٹوں پر قابو پالیا تو اس کے بعد ملک میں خالص سیکولر حکومت قائم کی۔ اس وقت پارلیمنٹ کے ایوان میں نو سو سے زائد نشستیں ہیں جن میں صرف تین سو سے کچھ اوپر نمائندے انتخابات کے ذریعہ ایوان

میں آتے ہیں اور باقی تقریباً چھ سو افراد نامزد ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی جماعت انتخابات میں سو فیصد کامیابی حاصل کرے تب بھی وہ ایوان میں اکثریت حاصل نہیں کر سکتی۔
(جہان دیدہ، ص ۳۷۹)

حکومت کے زیر انتظام چلنے والی دو اسلامی یونیورسٹیوں میں "یہ دیکھ کر حیرت کے ساتھ افسوس ہوا کہ دونوں جگہ نظام تعلیم مخلوط ہے۔ اس صورت حال سے خود یونیورسٹی کے بعض اساتذہ بھی ناخوش معلوم ہوتے تھے لیکن اپنی اس رنجیدگی کا علاج فی الحال ان کے بس میں نہیں"۔۔۔۔"جب احقر نے ایک یونیورسٹی کے ذمہ دار ترین فرد سے پوچھا کہ "اسلامی یونیورسٹی" میں مخلوط تعلیم کا کیا جواز ہے؟ تو انہوں نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ حیرت بھرے لہجے میں کہا کہ "یہ انڈونیشی اسلام ہے" البتہ یہاں طالبات کا لباس کافی ستر پوش ہے جبکہ عام تعلیمی اداروں میں طالبات کا عام لباس اسکرٹ ہے"۔ (جہانِ دیدہ، ص/۳۸۰ تا ۳۸۱)

مصر:

نپولین یہودیوں کا وہ شاہکار ہے جو انقلاب فرانس کی پیداوار تھا بالآخر اسے اپنی غلطیوں کی سزا بھگتنی پڑی جو یہودیوں نے اسے دی۔

(۱) مصر میں سیکولرائزیشن کا پہلا دور ۱۷۹۶ء سے ۱۸۱۰ء پر ختم ہوتا ہے۔(یعنی نپولین کے دور میں)۔

(۲) دوسرا دور ۱۸۱۱ء سے پورے مصر میں مملوکوں کے قتل عام سے ہوا۔ یہودی جو کام ۱۷۹۷ء میں نپولین سے نہ کرواسکے وہ ۱۸۱۱ء میں محمد علی سے زیادہ بڑے پیمانے پر کروالیا۔ ۱۸۱۴ء میں اس (محمد علی) سے یہودیوں نے وہی کام لیا جو ۱۷۹۳ء میں انگریزوں سے ہندوستان میں دوامی بندوبست کرواکر اور ۴۰۔۱۷۲۷ء میں اسٹالن سے روس میں Collectivization کروا کر لیا گیا۔۔۔۔۱۸۲۵ء سے ملک کو علمی اور فکری اعتبار سے سیکولرائز کرنے کی سرکاری کوشش شروع ہو چکی تھی۔۔۔۔

(۳) تیسرا دور ۱۸۱۱ء تا ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۶ء تا ۱۸۸۲ء ہے۔ سعید پاشا کے دور میں تو سیکولرائزیشن کے عمل کو سرکاری ہی نہیں بل کہ عوام کی نچلی سطحوں تک لاکر راسخ کرنے کی کوشش پوری ہوئی۔ اس دور میں (نہر) سوئز کی تعمیر ہوئی اور عالم اسلام کی متصل زمین دو حصوں میں بانٹ دی گئی۔ جس کے ذریعہ Logistically اور Strategically

عالم اسلام کو محصور کرلیا گیا یا منقسم کردیا گیا۔
(۴) چوتھا دور ۱۸۷۹ء تا ۱۹۱۴ء۔
(۵) پانچواں دور ۱۹۱۵ء تا ۱۹۵۲ء۔
(۶) چھٹا دور ۱۹۵۲ء تا حال۔

چھٹا دور ہی وہ دور ہے جس میں کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ ہوا اور اسی دور میں مصر نے قاہرہ میں عورتوں کی عالمی کانفرس کا انعقاد (۱۹۹۴ء) کیا۔
(عالم اسلامی کی اخلاقی صورت حال، از اسرار عالم: ص ۲۵۵ تا ۲۵۵)

الجزائر:

الجزائر ۱۸۳۰ء میں فرانس کے ہاتھوں میں چلا گیا۔۔۔ پورے ملک پر وہی قانون لاگو کر دیا گیا جو جنگل میں وحشی جانور بھی نافذ کرنے کا خواب نہیں دیکھ سکتے، یہ مسلم خون ارزانی کا ایک دردناک دور تھا۔ بالآخر پوری آبادی ملک میں سہم اور سمٹ گئی۔ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۲ء کے دوران پورے استبداد کے ساتھ الجزائر کا سیکولرائزیشن شروع کیا گیا، چناں چہ وہاں کی بے شمار آبادی دین کو بچانے کے لیے مراکش اور دوسرے علاقوں میں چلی گئی، حسین بے، شاکر اور احمد بے کی کوششوں کے پس پردہ الجزائر کو بھی اسی راہ پر لے جایا گیا جس پر مصر میں محمد علی، عباس، سعید، اسماعیل اور توفیق پاشا گئے تھے۔ محمد بے (۵۹۔۱۸۵۵) محمد الصادق (۸۲–۱۸۵۹) اور خیر الدین پاشا کی سرپرستی میں سیکولرائزیشن کا عمل سختی کے ساتھ شروع کیا گیا جس کا پہلا قدم تھا لامرسا کا کنونشن (Convention of Lamarsa) تھا جو ۱۸۸۵ء میں نافذ ہوا۔ ۱۸۸۱ء کے بعد اسلامی قوانین کا خاتمہ اور معاشرے سے اس کے اثرات کی بے دخلی شروع ہوئی۔۔۔ تعلیم کی راہ سے سیکولرائزیشن کو آگے بڑھانے کی متعدد اور مختلف النوع کوششیں ہوئیں۔ (ایضاً: ص ۲۵۷)

الجزائر میں سارے مشرق وسطیٰ کی طرح قومیت، آزادی اور بیداری کے نام پر رفتہ رفتہ انہیں سیکولر قوتوں نے عوام کی قیادت سنبھال لی، مصر میں یہ قیادت انیسویں صدی کے اواخر میں ترکوں، البانویوں چرکسیوں کے خلاف قائم ہوئی۔ لبنان، شام اور جزیرۃ العرب میں ترکوں اور خلافت عثمانیہ کے خلاف، اسی طرح تیونس (الجزائر) میں یہ قیادت کی تبدیلی ترکی اور ترکوں کے خلاف تھی، جو تیونسی قومیت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔۔۔ دوسری جنگ عظیم

کے بعد وہ طبقہ جو نئی تعلیم کے ذریعہ پیدا کیا جارہا تھا، قیادت سنبھالنے لگا۔ اور آخرکار ۱۹۵۶ء میں تیونس آزاد ہوکر سیکولرائزیشن کے نئے مرحلے میں داخل ہوگیا۔
(اخلاقی صورت حال،ص ۲۵۷،۲۵۸)

مراکش:

مراکش میں مولائے سلیمان (۱۸۵۲۔۱۷۸۲) کے عہد میں سیکولرائزیشن کا آغاز ہوا۔ ۱۸۵۶ء کے معاہدہ نے سیکولرائزیشن کی ہر راہ کھول دی اور مخزن کے اختیارات کو بالکل محدود کر دیا اور ۱۸۶۳ء کے بعد مولائے حسن نے اپنی فوج کو انہیں سیکولر قوتوں کے حوالے کر دیا۔ اور پھر مولائے عبدالعزیز کی مغرب پسندی کے نتیجہ میں مراکش بالآخر ۱۹۱۲ء میں فرانس کا استعمار بن گیا۔۔۔۱۹۵۶ء میں مراکش کو آزادی نصیب ہوئی لیکن سیکولرائزیشن کا عمل زیادہ تیزی سے جاری رہا۔ اور آخرکار ۱۹۶۱ء کے بعد ملک کے اصل باگ ڈور فری میسوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ (ایضا،ص ۲۵۹۔۲۵۸)

انڈونیشیا:

انڈونیشیا پر علما کے گہرے اثرات تھے۔ سیکولر قوتوں نے علما کی ان تمام تحریکوں کو بڑی بے دردی سے کچل دیا۔۔۔اور معاشرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ دو حصے تھے قوم مدا (Kaum Muda) یعنی نوجوان طبقہ۔ اور قوم طوا (Kaum Tua) یعنی قدیم طبقہ۔۔۔آزادی کے بعد پنج شیل کے تحت کیسلارسن (Kesalarasan) اور تیپو سلیرو (Tepo Saliro) یعنی یک جہتی اور رواداری میں تبدیل ہوگیا۔ اب اسلام اور روحانیت کی منزلیں سیکولرزم سے طے ہونے لگیں۔ (ایضا،ص ۲۶۰)

افغانستان:

افغانستان میں سیکولرزم امان اللہ خاں اور ظاہر خاں کے عہد میں کھل کر سامنے آیا۔ داؤد، ترہ کی، حفیظ اللہ امین، ببرک کرمال اور نجیب اللہ کے ریلوں نے افغانستان کو سیکولرائزیشن کے سمندر میں غرق کر دیا۔ (ایضا،ص ۲۶۱)

عراق:

عراق میں ۱۸۱۷ء سے سیکولرزم کی ابتدا ہوئی۔ پہلے داؤد پاشا پھر محمد رشاد پاشا، پھر

سب سے زیادہ مدحت پاشا کے عہد میں اسے آگے بڑھنے کا موقع ملا، محمد الہاشی کے عہد میں اس نے قومیت کی شکل اختیار کرلی۔۔۔

سیکولرائزیشن کا عمل سب سے زیادہ فوجیوں میں بارآور ہوا اور بعد میں اقتدار پر قبضہ کرکے جبر واستبداد کی حکومت قائم کی گئی۔ ۱۹۶۳ء میں عبدالکریم قاسم کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا اور جب عبدالسلام محمد عارف کی سربراہی میں بعث پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو سیکولرائزیشن خطرناک رخ اور برتاؤ اختیار کرچکا تھا۔

پاکستان:

پاکستان ۱۹۵۱ء کے بعد برطانوی طرز کے سیکولرائزیشن نے روسی اور امریکی طرز سے مل کر ۱۹۵۸ء میں فوجی قوت کے ذریعہ راسخ بنادیا گیا۔ اس کا دور کمال ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۵ء کے درمیان آیا جو بوجوہ نقطہ کمال تک نہ پہنچ سکا، جس کے دو اسباب تھے: (۱) ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش اور (۲) ۱۹۷۳ء میں افغانستان کی تبدیلیاں۔

ملک شام جو علمی اور دینی اعتبار سے عالم اسلام کا اہم ترین خطہ رہا ہے لیکن:

جب یہاں بعث پارٹی کی اور بالخصوص حافظ الاسد کی حکومت آئی، اس نے یہاں کے دینی حلقوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا۔ حافظ الاسد عقیدۃً نُصیری ہیں جو روافض کا انتہائی غالی فرقہ ہے اور سیاسی ومعاشی نظریات میں کمیونزم کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ اس حکومت نے پورے ملک کو ایک وسیع جیل خانہ میں تبدیل کرکے یہاں کے نہایت مقتدر علماء اور مسلمان زعماء کو اتنی اذیتیں پہنچائیں کہ ان کی ایک بہت بڑی تعداد کو جلاوطن ہونا پڑا۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد حکومت کو دینی حلقوں کا صفایا کرنے کے لیے ایک دورہ سا پڑتا ہے جس میں سینکڑوں بل کہ ہزاروں مسلمان لقمہ اجل یا بدترین اذیتوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ حمی کے شہر میں علما کا جس طرح قتل عام ہوا اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

حکومت کی طرف سے عورتوں کے دوپٹے زبردستی اتارنے کی تحریک شروع کی گئی۔ قدیم دینی مدارس سب ختم کردیے گئے اور باقائدہ دینی تعلیم صرف کالجوں اور یونیورسٹیوں کے شعبہ اسلامی علوم میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ (جہان دیدہ: ۳۰۹)

جو علماء اب شام میں مقیم ہیں ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ وہ سیاست سے بالکل الگ

ہو کر خالصۃً تعلیم وتبلیغ میں مشغول ہیں، اور ان حالات میں یہی حکمت عملی ہے جس کے ذریعہ یہاں مسلمانوں کے دین وایمان کا تحفظ کیا جاسکتا ہے۔ (ص ۳۰۹)

اردن:

۱۹۴۶ء میں موجودہ شاہی خاندان نے المملکۃ الہاشمیہ الاردنیہ کے نام سے اپنی بادشاہت قائم کی اردن پر امریکی اثرات روز افزوں ہیں اور ان کی وجہ سے دینی فضاء بھی خراب ہورہی ہے۔ ذرائع ابلاغ سے عریانی وفحاشی کے پرچار پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ انتہائی عریاں اور مخرب اخلاق فلموں کی نمائش ٹی وی کے روزمرہ کے معمول میں داخل ہے۔

(جہان دیدہ، ص ۲۴۹)

ترکستان:

کمال اَتاترک کے زمانے سے یہاں سیکولر نظام حکومت کا راج ہے، لیکن اپنی ابتدا میں یہ عجیب وغریب سیکولر نظام تھا جس میں مسلمانوں کے خالص دینی شعائر پر بھی نہایت پرتشدد پابندی عائد کی گئی تھی لوگ آذانوں تک کو ترس گئے تھے عربی زبان میں اسلامی علوم کی تعلیم کو جرم قرار دے دیا۔ گناہ تھا لوگوں کو زبردستی ٹوپی کی جگہ ہیٹ پہنانے کے لیے باقاعدہ خونریزی کی گئی تھی، غرض لادینیت کے وہ جنونی (Fanatic) مظاہرے یہاں دیکھنے میں آئے تھے جو شاید عالم اسلام کے کسی اور حصے میں نہیں دیکھے گئے، بعد میں رفتہ رفتہ اس قسم کی پابندیاں تو اٹھ گئیں لیکن ملک کا سیاسی ڈھانچہ علی الاعلان سیکولر ہی رہا، اور دینی سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی کی پالیسی عرصہ دراز تک برقرار رہی۔ (دنیا مرے آگے، ص ۷۹)

۱۳ر مارچ ۱۹۲۴ء کو کمال اتاترک نے سیکولر ترکی کا تصور پیش کیا۔ وہ اسمبلی میں بل لے کر گیا، وہاں اس نے کہا: "عثمانی سلطنت اسلام کے اصولوں پر قائم ہوئی، اسلام اپنی شناخت اور تصورات کی لحاظ سے عرب ہے، وہ پیدائش سے موت تک اپنے پیروکاروں کی زندگی کی تشکیل دیتا ہے۔ انہیں اپنے مخصوص سانچے میں ڈھالتا ہے، ان کی امنگوں، ان کی خواہشوں کا گلا گھونٹتا ہے، ان کی جرأت اور آگے بڑھنے کی خواہش میں روڑے اٹکاتا ہے۔ لہٰذا میرا فیصلہ ہے کہ اگر ترکی میں اسلام رہا تو ترکی نہیں بچ سکے گا۔ چناں چہ میں آج سے اسلام اور خلافت دونوں کے خاتمہ کا اعلان کرتا ہوں"۔

(ترکی میں اسلام کا سفر۔ یاسر محمد خان، ص ۲۷۷)

اَتاترک نے پانچ بڑے اقدامات کیئے:

عثمانی خلافت ختم کردی۔ خلیفۃ المسلمین ترکی میں اسلام اور اسلامی سلطنت کی واحد علامت تھا خلافت کے خاتمہ کے بعد عالم اسلام کا شیرازہ بکھر گیا۔ امت چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں میں تقسیم ہوگئی۔ انہوں نے ترکی میں اسلام پر پابندی لگادی۔ مسجدوں کو تالے چڑھا دیئے گئے۔ قرآن مجید، حدیث، اور فقہ کی کتابوں کی نشر واشاعت ممنوع قرار دی گئی۔ عربی رسم الخط ختم کرکے لاطینی حروف تہجی کے رواج کا حکم دے دیا۔ عربی میں اذان دینے پر پابندی لگادی۔ دینی تعلیم ختم کردی گئی۔ مدرسے بند کردیئے۔ پردے کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ مخلوط تعلیم کو لازمی بنادیا۔ اسلامی لباس ختم کردیا، اور ہیٹ کا استعمال تمام مردوں اور عورتوں کے لیے لازمی قرار دے دیا۔ انہوں نے ملک کا قانون بدل دیا۔ ملک میں سوئٹزرلینڈ کا دیوانی، اٹلی کا فوجداری، جرمنی کا معاشی اور کاروباری اور یورپ کا خاندانی قانون نافذ کردیا گیا۔ انہوں نے سوسائٹی میں فحاشی اور عریانی عام کردی۔ ملک بھر میں سرکاری سرپرستی میں شباب اور جوے خانے کھولے گئے۔ عصمت فروشی کو باقاعدہ کاروبار کی شکل دی گئی۔ رقص گاہیں تعمیر کی گئیں۔

قانون بنایا گیا ملک میں اس وقت تک کوئی ہوٹل کھل سکتا ہے اور نہ ہی رستوران جب تک مالکان اس میں شراب خانہ کھولنے کی یقین دہانی نہ کرادیں۔ ان اقدامات کے باعث پوراترکی شدید قسم کی عریانی اور فحاشی کا شکار ہوگیا اور انہوں نے فوج کو اس سیکولرزم کا ضامن بنادیا۔ ملک کے تمام شعبوں اور تمام اداروں کو فوج کے ماتحت کردیا۔ اتاترک کے بعد بھی جب فوج نے چاہا پارلیمنٹ معطل کرکے "ناپسندیدہ" سیاست دانوں کو گھر بھجوا دیا۔ اَتاترک کی ان اصلاحات کے نتائج فوری طور پر ظاہر ہونے لگے۔ عربی اور فارسی رسم الخط ختم ہونے سے ترک قوم کا اپنی اساس سے رابطہ ٹوٹ گیا اتاترک سے پہلے عالم اسلام کے تمام بڑے کتب خانے ترک میں تھے۔ صوفیا کرام کے بڑے بڑے سلسلوں کی جڑیں ترکی کی طرف جاتی تھیں۔ مدارس اور علماء کرام کے تمام بڑے مراکز ترکی میں تھے۔ لیکن جوں ہی رسم الخط بدلا، یہ کتب خانے ردی کی دکانیں بن گیے۔ مدرسوں اور خانقاہوں پر تالے چڑھ گیے اور تالوں پر مکڑیوں نے جالے بن دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹھیک ایک نسل بعد ترکی میں

قرآن مجید پڑھنے والے لوگ خال خال تھے۔نئی نسل کے عربی حروف اجنبی ہو چکے تھے۔ لوگ اسلامی ممالک سے آنے والے مسلمان سیاحوں سے عربی میں اذان سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔لوگ گھروں میں چھپا کرر کھے قرآن مجید کے اوراق کے تعویذ بنا کر گلے میں ڈالتے تھے۔سیکولرزم ماڈرنزم اور شخصی آزادیوں کا یہ نتیجہ نکلا۔ترکی قحبہ خانوں کا شمار دنیا کے بڑے قحبہ خانوں میں ہونے لگا۔قونیہ میں خواتین کا تین میل لمبا بازار بن گیا۔استنبول میں طوائفوں کے بازاروں کے نام عثمانی خلفاء کے القاب پر رکھے جانے لگے۔بے شمار فاحشہ عورتیں اپنا حسب نسب سلطان سلیم اور سلطان محمد سے ملانے لگیں۔ برطانیہ اور جرمنی کے بعد شراب کی سب سے زیادہ فیکٹریاں ترکی میں لگیں۔ترکی سے اسلام کا سماجی نظام بھی ختم ہو گیا۔ حجاب ممنوع قرار دے دیا گیا۔جہاں کہیں برقعہ یا اسکارف نظر آتا پولس آجاتی۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ان بچیوں کے نام خارج کر دیئے جاتے جو کبھی کبھار سرڈھاپنے کی جرم دار ہو جاتیں۔حد تو یہ تھی فوج نے ایک ایسی رکن اسمبلی کو حلف تک اٹھانے کی اجازت نہ دی جو اسکارف پہنتی تھی۔فوج اور سول بیورو کریسی میں ایسے افسروں کی نوکریاں خطرے میں پڑ جاتیں جن کے گھر کوئی سر ڈھاپنے والی خاتون ہوتی۔۱۲/ایسے فوجی افسر میرے علم میں ہیں جن کی بیویاں اسکارف لیتی تھیں۔اور اس کی پاداش میں انہیں فوج سے جبری ریٹائر کر دیا گیا تھا۔اسلام سے اس نفرت کی آپ حد ملاحظہ کیجیے: استنبول شہر میں ایسے بے شمار شراب خانے، جوا خانے، اور رقص گاہیں تھیں، جن کی طرز تعمیر میں اسلامی جھلک نظر آتی تھی جب کہ فوجی یونٹوں میں ۱۹۷۳ء تک چرچ جانے کی اجازت تو تھی۔لیکن جوان مسجد نہیں جا سکتے تھے۔کرسمس اور نیوایر کی چھٹیاں تو دے دی جاتی تھیں لیکن عیدین کی تعطیلات مشکل تھیں۔ (ترک میں اسلام کا سفر:ص ۲۷۸۔از یاسر محمد خان)

گزشتہ اوراق میں بعض مسلم ممالک لیکن سیکولرزم کا تصور مسلط کرنے کے زعم میں حکمراں طبقے کی طرف سے مذہب مخالف حالات اور مغرب سے درآمد کی گئی اخلاقی بیماریوں کے نتیجہ میں بدامنی اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کی روداد آپ نے سن لی۔اب صرف ایک ایسے ملک کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجیے جہاں کی حکومت اسلامی اصولوں کا کسی قدر نفاذ چاہتی ہے اور اسے سیکولرزم کا خبط نہیں ہے۔

مسلم شخصی حکومت میں مسلمانوں کی دینی حالت

برونائی:

برونائی کے شاہی حکمراں خاندان نے برونائی کو ایک حقیقی اسلامی ملک بنانے کے عزم کا اظہار کیا اور اس سمت میں کچھ عملی اقدامات بھی کیے جن میں شراب کی بندش کا قانون قابل ذکر ہے۔ وزارت مذہبی امور میں ایک مستقل محکمہ رائج الوقت قوانین کو اسلامی قوانین میں تبدیل کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ (دنیا میرے آگے۔ص ۶۲/۶۲)

پورے خطہ میں نظم وضبط مثالی ہے، امن وامان قابل رشک ہے اور جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ (ص ۷۳)

عوام میں اسلامی سوچ اور اسلامی طرز عمل سے محبت نمایاں ہے، مسجدیں انتہائی عالی شان ہیں لیکن دینی مدرسے نایاب ہیں یہاں کے علماء زیادہ از ہر کے تعلیم یافتہ ہیں، اب بچوں کی دینی تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے، حکومت نے حفظ قرآن کی ہمت افزائی کے لیے حفاظ کا خصوصی وظیفہ مقرر کیا ہے۔

حکومت بادشاہت کی روایتی رسوم ضرور کھلتی ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی حکمرانوں کا رُجحان اہل دین کے ساتھ معاندانہ نہیں بل کہ ہمدردانہ ہے، اس لحاظ سے اس ملک میں ایک نمونے کا اسلامی ملک بننے کی بڑی صلاحیت موجود ہے۔۔۔ حکومت اس طرف متوجہ تو ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں بعض قوانین تبدیل کیے گئے ہیں، ایک غیر سودی بینک قائم کیا گیا ہے۔ خواتین کے لباس میں حیا وحجاب کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مجمع الفقہ الاسلامی کے سالانہ آٹھویں اجتماع میں برونائی دارالسلام کے سلطان حسن البلقیا جو اپنے ملک میں اسلامی اقتدار کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں، کی صدارتی اور افتتاحی تقریر بہترین اسلامی جذبات کی آئینہ دار تھی۔ (دنیا میرے آگے۔ص ۶۴)

قومیت اور وطنیت:

علامہ شیخ محمد بیرم تونسیؒ جو آخری دور میں شمالی افریقہ کے بڑے مسلم الثبوت عالم تھے اور علوم دین کے علاوہ تاریخ وسیاست اور جغرافیہ پر بھی ان کی نگاہ بڑی وسیع تھی۔ وہ فرماتے

ہیں:

''اسلامی قومیت ایک ہی ہوتی ہے۔ اور مشاہدے سے بھی اس بات کی تردید ہوتی ہے (کہ باہر سے آنے والے مسلمان حکمرانوں کو وطن کا درد نہیں ہوتا) تاریخ سے یہ بات ثابت ہے اور مشاہدہ میں آچکی ہے کہ باہر سے آنے والے کتنے مسلمان حکمرانوں نے اپنے زیرِ حکومت علاقہ سے پوری وفاداری کی، اس میں حاصل ہونے والی نعمتوں پر شکر گزار رہے اور اسے خوبصورت اور مستحکم بنانے میں امانت و دیانت کا پورا خیال رکھا۔ اس کے برعکس بہت سے ابنائے وطن نے بالکل الٹا معاملہ کیا۔ لہٰذا درحقیقت کسی علاقے سے مسلمانوں کی حکومت زائل ہونے کا سبب حکمرانوں کی قومیت نہیں ہوتی۔ بل کہ سبب یہ ہوتا ہے کہ اس علاقے کے اکابر کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں وہ فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور اسی فسق و فجور کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ حکومت نااہلوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کا قول ان کے بارے میں سچا ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر ایسے لوگوں کو مسلط فرما دیتے ہیں جو اسے تباہ کر کے چھوڑتے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو قوموں کے زوال و انحطاط کی تاریخ سے ثابت ہوتی ہے۔ جو لوگ ملکوں کے حالات پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں وہ ان کے مصائب کو فساد کے اصل سبب کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ خواہ وہ سبب زمانہ کے اعتبار سے کتنا پرانا ہو۔

کسی ملک کا وہ آخری حکمراں جس کے ہاتھوں اس ملک کا زوال ہوتا ہے وہ درحقیقت ایک چھپے ہوئے مزمن مرض کی ظاہری علامت ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اللہ اور اس کے بندوں کے سامنے جواب دہ ضرور ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ اس مرض کو روکنے اور اس کا علاج کرنے کی استطاعت رکھتا تھا لیکن اس نے اسے کم کرنے کے بجائے اس کے بحران کو اور بڑھایا یہاں تک کہ وہ مرض امت کے لیے صاعقہ آسمانی سے زیادہ شدید ہو گیا۔ اس لیے کہ بیمار جسم ان عوارض سے متاثر ہو جاتا ہے جن سے صحت مند جسم متاثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا چوں کہ وہ حکمراں شر کی علامت ہوتا ہے اس لیے اس کی دنیا و آخرت کی رسوائی کے لیے یہ بات کافی ہے۔۔۔ (جہانِ دیدہ: ص ۱۱۵۔۱۱۶)

مسلمان دوسرے مسلمان بھائیوں سے خواہ کتنی ہی دور ہوں لیکن مسلمانوں کو اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے اتنی گہری دلچسپی رہتی ہے کہ مسلمان خواہ زمین کے کسی حصہ میں

آباد ہوں، دوسرے مسلمانوں کے دل ہمیشہ ان کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔

مادے کے پار دیکھنے کی صلاحیت جس میں نہیں۔ روح میں نہ بجھنے والی پیاس کا مداوا بھی ان کے پاس نہیں:

اب تک کی تفصیل سے یہ معلوم ہوگیا کہ عدل اور انسانیت کے لیے سکون نہ اشتراکی نظام میں ہے اور نہ سیکولرزم میں۔ دوسری طرف یہ صورت حال بھی پیش نظر رہے کہ گزشتہ چند صدیوں کے دوران اہلِ مغرب بہت سے نظامہائے فکر کا عملی تجربہ کر چکے ہیں، انہوں نے پوپ پرستی سے لے کر انکار خدا تک ہر فکری نظام کو آزما کر دیکھ لیا ہے ان کا قدیم مذہب ان کی مادی اور سائنسی ترقیات کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوا، لیکن جب انہوں نے اس مذہب کو عملاً خیر باد کہہ کر زندگی کی مادہ پرستانہ تعبیر کو اپنایا تو اپنی تمام تر مادی ترقیات کے باوجود وہ روح کے سکون اور ضمیر کے اطمینان سے محروم ہوگئے، وہ چاند اور مریخ پر کمندیں ڈالنے کے باوجود اس روح میں جو نہ بجھنے والی پیاس محسوس کرتے ہیں اس کا کوئی مداوا اس زندگی کے پاس بل ہی نہیں سکتا، جو مادے کے پار کچھ دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

(جہانِ دیدہ:۴۷۹)

لبرلزم سیکولرزم کا اصل نعرہ۔ قیصر کا حق قیصر کو دو اور کلیسا کا حق کلیسا کو دو:

ملک کا سیاسی سربراہ قیصر اور مذہبی سربراہ پوپ ہے۔ ''قیصر کا حق قیصر کو دو اور کلیسا کا حق کلیسا کو دو''...... رومی سلطنت نے جب سے عیسائی مذہب اختیار کیا تھا، وقفہ وقفہ سے رومی سلطنت کے بادشاہ اور پوپ کے درمیان شدید کشمکش، سلطنت کی یکجہتی کے لیے زبردست خطرہ بنی رہی۔ پوپ کے بارے میں عیسائی عقیدہ یہ ہے کہ وہ معصوم اور غلطیوں سے پاک (infallibible) ہوتا ہے۔ چناں چہ جو حکم وہ جاری کردے وہ تمام عیسائیوں کے لیے ایک خدائی کا حکم کا درجہ رکھتا ہے، اس کے یہ احکام صرف شارح (interpretter) کی حیثیت میں نہیں بل کہ شارع اور قانون ساز (Legislator) کی حیثیت میں واجب التسلیم ہوتے ہیں۔۔۔ بادشاہ مذہبی رہنما کی حیثیت سے پوپ کی عزت کرتے اور اسے مقدس باپ، کا لقب دیتے ہیں۔۔۔ لیکن جب یہ مقدس باپ کوئی حکم جاری کرتا جسے بادشاہ اپنی حدود اختیار میں مداخلت سمجھتا تو دونوں میں لڑائی ٹھن جاتی رومن کیتھولک عیسائیوں کی

صدیوں کی تاریخ بادشاہ اور پوپ کی اس کشاکش سے لبریز ہے۔

بالآخر ۱۱ فروری ۱۹۲۹ء میں اس مشکل کا حل اٹلی کی ریاست اور پوپ کے درمیان ایک معاہدے کی صورت میں نکالا جسے (Lateran Treaty) کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے ویٹی کن کے علاقے کو پوپ کی سربراہی میں ایک مستقل، آزاد اور خودمختار ریاست کی شکل دے دی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کی نشاۃ ثانیہ مکمل ہو چکی تھی لبرلزم کا ڈنکا بج رہا تھا، اور عیسائی مذہب اور اس کے علماء کی تنگ نظری اور چیرہ دستیوں سے نفرت اور بیزاری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس نے لوگوں کو مذہب ہی سے منحرف کر دیا تھا، لہٰذا پوپ کے لیے اپنا عالمگیر اقتدار قائم رکھنا ممکن نہیں رہا تھا، اس لیے شاید اس وقت پوپ نے اس بات کو غنیمت سمجھا کہ ایک مختصر دائرے میں ہی سہی، اس کے اقتدار کو فی الجملہ تسلیم تو کر لیا جائے۔ (دنیا مرے آگے، ص ۳۳۶، ۳۳۷)۔۔۔ اور اس طرح دنیوی نظام اور ریاست میں مذہبی مداخلت ممنوع قرار پائی، مذہب سے وابستگی اگر چاہیے تو چرچ میں جانا پڑے گا یا ویٹی کن میں۔ اور مملکت میں تو سیکولر ڈیموکریسی یا لادینی جمہوریت ہی مقبول عام نظریہ اور سکہ رائج الوقت قرار پایا۔

سیکولر ڈیموکریسی کا مطلب ہوتا ہے، لادینی جمہوریت نہ کہ محض جمہوریت:

موجودہ دور میں سیکولرزم کو جدید ترین نظریہ کے طور پر اس طرح قبول کر لیا گیا ہے کہ دین مذہب کا انسان کے اجتماعی مسائل سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔

ٹورنٹو کے سیمنار میں مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہٗ نے ''اپنا موضوع یہ رکھا تھا اور ''اسلام اسلامی شریعت بنیادی طور پر کیا ہیں؟ اور انسان کے سماجی اور معاشی (Socio-economic) مسائل سے اسلام کا کیا تعلق ہے''؟ یہ وضاحت اس لیے ضرور تھی کہ موجودہ دور میں سیکولرزم کو جدید ترین نظریہ کے طور پر اس طرح قبول کر لیا گیا ہے کہ دین و مذہب کا انسان کے اجتماعی مسائل سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ مذہب کو ایک شخصی معاملہ قرار دے کر اسے خاص طور پر معاشی اور عمرانی مسائل سے یکسر خارج کر دیا گیا ہے۔ چناں چہ جو لوگ اس نظریہ پر ایمان لا کر پلے بڑھے ہیں عام طور سے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کسی دین و مذہب کا تجارت و معیشت سے تعلق کیا ہے؟ لہٰذا میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش

کی کہ اسلام محض چند عبادات وعقائد تک محدود نہیں ہے بل کہ وہ زندگی کے ہر اس شعبہ میں ہدایت فراہم کرتا ہے جہاں عقل انسانی کے ٹھوکر کھانے کا احتمال موجود ہو۔

اس ضمن میں میں نے عقل کی حدود (limitations) اور وحی الٰہی کی ضرورت واہمیت پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے اسلام کی معاشی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ سوشلزم یا کمیونزم کی شکست کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو اب ایک حقیقت مطلقہ (Absolutrth) کے طور پر تسلیم کرلیا جائے۔ جیسا کہ مغرب کے بعض حلقے دنیا کو باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ سیکولر ڈیموکریسی اور سرمایہ دارانہ معیشت پر انسانی تاریخ اپنے آخری عروج تک پہنچ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے امریکی وزارت خارجہ کے ایک افسر کی مشہور کتاب (The end of the history and the lasman) کا حوالہ دیا جس میں تقریباً یہی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ سوشلزم یا کمیونزم سرمایہ دارانہ معشیت کی بعض سنگین ناانصافیوں کا ردعمل تھا۔

آج اسے اگر اپنی ذاتی خامیوں (Intrinsic Faults) کی وجہ سے شکست ہوگئی ہے تو یہ سمجھنا خود فریبی ہوگی کہ سرمایہ دارانہ معیشت کی خرابیاں دور ہوگئی ہیں۔ جب تک تقسیم دولت میں ناانصافیوں اور ناہمواریوں کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ اگر آج ایک کمیونزم نے شکست کھائی ہے تو کل کوئی دوسرا فتنہ کھڑا ہو جائے گا اور انسانیت اسی طرح افراط وتفریط کے گرداب میں مبتلا رہے گی۔ (دنیا میرے آگے: ص۱۴۲)

''ہم خدا پر بھروسہ کرتے ہیں'': حیرت انگیز بات ہے کیوں کہ اگر خدا موجود ہے تو زمین کو اس کی حاکمیت سے محروم کیسے کیا جاسکتا ہے؟

اگر کوئی شخص خدا پر یقین رکھتا ہے اور اس کا دعوی یہ ہے کہ ہم خدا پر بھروسہ کرتے ہیں، (واضح رہے کہ آج بھی امریکہ کے ہر ڈالر پر یہ فقرہ چھپا ہوا ہے کہ ہم خدا پر بھروسہ کرتے ہیں) تو یہ بات قطعی غیر منطقی اور نامعقول ہوگی کہ خدا کو کائنات کا خالق بھی مانا جائے اور اس زمین پر اس کی حاکمیت کا انکار کر کے اپنے سیاسی، معاشی اور سماجی معاملات میں اس کے احکامات کا داخلہ بھی ممنوع قرار دیا جائے، اگر خدا موجود ہے اور کائنات پر اس کی حکمرانی قائم ہے تو زمین پر بھی اس کی حکمرانی چلنی چاہئے، اور زمین کو اس کی حاکمیت سے محروم نہیں کیا

جاسکتا، اور جب ایک مرتبہ یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty) اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے تمام قوانین اسی کے احکام کے تابع ہونے چاہئیں۔

پھر میں نے قدرے تفصیل سے عرض کیا کہ جس طرح دنیا کی ہر چیز حسی مشاہدے سے معلوم نہیں ہوسکتی، یعنی ایک حد پر جاکر مشاہدہ کام نہیں دیتا بل کہ عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی طرح عقل کی رہنمائی بھی لامحدود نہیں، بل کہ ایک حد پر جاکر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی رہنمائی درکار ہوتی ہے، اور وحی کے ذریعہ اللہ کے احکامات معلومات ہوتے ہیں، وحی الٰہی کی محفوظ ترین شکل ہمارے پاس قرآن کریم ہے اور اس کے بعد وہ تشریحات ہیں جنھیں دے کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم کے ساتھ بھیجا گیا۔لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو زمین پر نافذ کرنے کے لیے قرآن وسنت ہی بنیادی سرچشمے ہیں جن کی اساس پر اسلامی قانون استوار ہے۔(دنیا مرے آگے۔ص ۳۲۸،۳۲۹)

زندگی کے تمام مسائل کو ٹھیک حل کرنے کے لے تنہا عقل انسانی ناکافی ہے، اس کے لیے وحی الٰہی کی ضرورت ہے:

مغربی ملکوں میں رہائشی مکان کا حصول ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔عام طور سے لوگ بینکوں سے قرض لے کر مکان حاصل کرتے ہیں لیکن جو مسلمان سود سے پرہیز کرنا چاہتے ہیں وہ ایسے ادارے قائم کر رہے ہیں جہاں لوگوں کو سود کے بغیر رہائشی سہولت مہیا ہو۔۔۔۔ ہمارے ایک سفید فام نو مسلم عبدالقادر اسٹیون (جن کا سابق نام تھامس اسٹیون تھا) خاص طور سے اس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں۔اسکیم کے قانونی پہلوؤں کی دیکھ بھال کے لیے انہوں نے نیویارک کے ماہرین قانون کی ایک مشہور فرم گوڈرٹ برادرز کی خدمات حاصل کیں۔اسکیم کے شرعی قانونی اور عملی پہلوؤں پر مشورے کے لیے انہوں گوڈرٹ برادز کے دفتر میں ایک ملاقات رکھی تھی جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔جس میں گوڈرٹ برادز کے طرف سے مسٹر پیٹر اپنے دو معاونین کے ساتھ موجود تھے۔دوپہر کے کھانے کا بھی اہتمام کیا گیا تھا جس میں فرم کے دوسرے ممتاز ماہرین قانون کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔۔۔۔اس کھانے میں اکثریت غیر مسلم حضرات کی تھی۔۔۔۔ مسٹر پیٹر نے میرے مختصر تعارف کے بعد دوسرے

غیر مسلم حاضرین سے کہا کہ آپ لوگوں کے ذہن میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مختلف قسم کے سوالات اٹھتے رہتے ہیں۔ اگر آپ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے کچھ سوالات کرنا چاہیں تو اس کے لیے یہ ایک مناسب موقع ہے، بس پھر کیا تھا۔۔۔ چاروں طرف سے سوالات کا سلسلہ شروع ہوگیا اور یہ کھانے کی محفل ایک دلچسپ محفل مذاکرہ میں تبدیل ہوگئی۔ بعض حاضرین کے سوالات قدرے جارحانہ تھے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم تھا کہ میں اطمینان سے ان کا جواب دیتا رہا۔ ایک مرحلے پر سوالات کا مجموعی رخ دیکھتے ہوئے میں نے ایک اصولی بات کرنا مناسب سمجھا۔

اصولی بات:

میں نے عرض کیا کہ چوں کہ سیکولر نظریہ حیات مغرب کا سکہ رائج الوقت ہے، اس لیے بنیادی طور پر یہ بات بسا اوقات مغربی ذہن کے سمجھ میں نہیں آتی کہ زندگی کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں کو دین ومذہب کی جکڑ بند میں مقید کیوں کیا جائے؟

نیز یہ کہ تقریباً ڈیڑھ صدی (ڈیڑھ ہزار سال) پہلے کی تعلیمات بیسوی اور اکیسوی صدی میں کیوں کر کارآمد ہوسکتی ہیں؟ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے مختصراً یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ زندگی کے تمام مسائل کو ٹھیک ٹھیک حل کرنے کے لیے تنہا عقل انسانی کس طرح ناکافی ہوتی ہے؟ اور اسے وحی الٰہی کی کیوں ضرورت ہے؟ پھر میں نے یہ بھی عرض کیا کہ آج مغربی دنیا سویت یونین کی شکست وریخت اور سوشلزم کی ناکامی پر خوشیاں منارہی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ سوشلزم، سرمایہ دارانہ نظام کی جن خرابیوں کے ردعمل کے طور پر ابھرا تھا کیا وہ خرابیاں سرمایہ دار ممالک سے دور ہوگئیں؟ اگر نہیں تو سودیت یونین کے زوال کو سوشلزم کی شکست تو کہا جاسکتا ہے، سرمایہ داری کی فتح نہیں۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام اپنی وہ خرابیاں دور کرنے پر تیار نہ ہو تو کل کوئی اور ردعمل ظاہر ہوسکتا ہے۔ حاضرین کے سوالات کے جواب میں، میں نے اسلام کی بعض معاشی تعلیمات کی تشریح کی اور ساتھ ہی یہ شکایت بھی کی کہ جب کبھی کہیں ان تعلیمات پر عمل کی دعوت ابھرتی ہے تو مغرب میں اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بجائے یہ شور مچانا شرع ہوجاتا ہے کہ یہ بنیاد پرستی ہے، رجعت پسندی ہے اور ان تعلیمات کے داعی گھڑی کی سوئی کو پیچھے لے جانا چاہتے ہیں۔ اور اس شور وغل کے نتیجہ میں

مفاہمت کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔حاضرین نے کھلے دل سے یہ گزارشات سنیں اور بعض اسلامی تعلیمات کی تشریح میں جو باتیں کہی گئیں تھیں انہیں تخلیقی (creative) قرار دیا۔(دنیا مرے آگے، ص۱۲۳،۱۲۲)

جمہوریت کا ایک پہلو۔جس میں جمہوری ممالک کی ترقی کا راز پنہاں ہے:

ھلنسکی (فن لینڈ) میں شام کے وقت ہم چہل قدمی کے لیے اس کے پارلیمنٹ اسکوائر والی سڑک پر نکلے تو تھوڑی دیر میں دیکھا کہ ایک جھنڈے والی کار سگنل کے سامنے آ کر رُک گئی، اور عام کاروں کے ساتھ آگے بڑھی، بعد میں پتہ چلا کہ یہاں کی پرائم منسٹر کی کار تھی، اور وہ اس میں موجود تھیں، اس کے آگے پیچھے نہ کوئی پائلٹ نظر آیا، نہ پولس کی گاڑیاں دکھائی دیں۔یہاں کے لوگوں نے بتایا کہ پچھلے دنوں یہ پرائم منسٹر (جو ایک خاتون ہیں) ایک سپر مارکیٹ میں خریداری کے لیے گیس تو عام آدمیوں کے ساتھ لائن میں لگیں رہیں اور جب ان کا نمبر آیا تب خریداری کی۔(ایضا،ص۳۲۴)

اوسلو (ناروے) میں میں نے جس ڈاکٹروں کے اجتماع سے خطاب کیا تھا، اس میں گورنر ایک عام آدمی کی طرح شریک تھا، کھانے کا وقت آیا تو وہ بے تکلفی سے مجھ سے بات کرنے کے لیے میری میز پر اپنی پلیٹ میں کھانا لے کر میرے پاس آبیٹھا، اور جب جانے کا وقت آیا تو سادگی سے اٹھ کر اپنی کار میں بیٹھ گیا، پروٹوکول کے جو ٹھاٹ باٹ ہمارے یہاں رواج پا گئے ہیں، وہ یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔(دنیا مرے آگے، ص۳۲۴،۳۲۳)

یورپ نے اپنے اپنے ممالک میں جن اخلاقی قدروں کو فروغ دیا ہے، اور محنت و کاوش اور قومی ہمدردی کے تحت باشندوں کو جو سہولیات مہیا کی ہیں، انسان کی قدر افزائی اور اس کی انسانی عظمت کے تحفظ کے لیے جو مجموعی طرز عمل اختیار کیا ہے، وہ بلاشبہ قابل تعریف ہے، وہاں حکام اور عوام کے درمیان غیر معمولی فاصلے بھی نہیں ہیں۔(جیسا کہ اوپر کی دو مثالوں سے ظاہر ہوا۔ف)۔(دنیا مرے آگے، ص۳۲۳)

غرض سادگی، صفائی ستھرائی، حسن انتظام، معاملات کی صفائی اور امانت اور احساس ذمہ داری کا مظاہرہ ہمیں تقریباً روزانہ ہی نظر آتا رہا اور محسوس ہوا کہ یہ صفات معاشرے میں اچھی طرح رچا بسا دی گئی ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ یہی صفات ہیں جنہوں نے ان اقوام کو دنیا

میں عروج دیا ہے۔ (دنیا مرے آگے، ص ۲۲۴)

حقیقت میں یہ تمام صفات اسلامی تعلیمات کا حصہ ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ہم نے انہیں چھوڑ دیا، اور ان اقوام نے ان پر عمل کر کے عروج حاصل کیا۔

جمہوری اقوام کا دوسرا متضاد پہلو: ’’زندگی گذارنے کے طریقے میں اور عائلی زندگی میں جانوروں کی سطح سے بھی نیچے‘‘:

دوسری طرف انہی اقوام کی بعض صفات ایسی ہیں کہ انہیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف عملاً پستی میں جانوروں کی سطح سے بھی نیچے پہنچ گئے ہیں بل کہ انہوں نے اپنے معتقدات کی لحاظ سے حماقت اور نادانی کی انتہا کر رکھی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں کائنات کی بال کی کھال نکالنے کے باوجود ابھی تک وہ اس ایمان واعتراف کی دولت سے محروم ہیں کہ کائنات کا یہ محیر العقول نظام کسی بنانے والے کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا، اور اسی بنانے والے کا یہ حق ہے کہ وہ انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کا طریقہ بتائے۔ یہ سامنے کی بدیہی بات (یعنی دو اور دو چار کی طرح سمجھ میں آنے والی بات لیکن۔ف) ابھی تک سائنس اور حرفت کے ان سورماؤں کی سمجھ میں نہیں آسکی، اور یہاں پہنچ کر ان کی ساری حکمت ودانائی ہوا ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف اپنے اپنے ملکوں میں بری طرح راحت وآسائش کے تمام اسباب جمع کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے معاشرتی ڈھانچے کو جس بری طرح تباہ کیا ہے وہ ہر چشم بینا کے لیے ایک درس عبرت ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ناروے کی آبادی کا مختصر حصہ شادی شدہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آبادی کی اکثریت شادی کے بغیر، ’’مادر پدر آزاد‘‘ زندگی گزار رہی ہے، خاندان کا تصور ہی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ماں باپ اور بھائی بہن کے رشتے اپنی مٹھاس کھو چکے ہیں، ہر شخص پیسے کی دوڑ میں مبتلا ہے۔ اور اس کی جدوجہد اپنی ذات کی حد تک محدود ہے۔ مہمان اور مہمان نوازی کا معاشرتی زندگی میں کوئی تصور نہیں۔ بر سر عام فحاشی کوئی عیب کی بات نہیں۔ ہم جنس پرستی کی لعنت نے انسانی فطرت مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ ساری دنیا میں تمباکو نوشی کے خلاف مہم چلانے والے اور نشہ آور اشیاء کو جرم قرار دینے والے جب چھٹی کی رات میں شراب کے جام کے جام لنڈھانے پر آتے ہیں اور بدحواس ہو کر جو حرکتیں کرتے ہیں تو ان میں اور جانوروں

میں تمیز نہیں کی جاسکتی۔ ھلسنکی جاتے ہوئے جس جہاز کے خوبصورت سفر کا میں نے ذکر کیا، اس کا وحشت ناک پہلو یہ تھا کہ رات کے وقت تقریباً سب افراد نشے میں مدہوش ہوکر وہ طوفان بدتمیزی مچائے ہوئے تھے کہ ہمارا کیبن سے باہر نکلنا مشکل ہوگیا، اور بے ساختہ زبان پر یہ کلمات آئے کہ **الحمد لله الّذی عافانا مما ابتلاهم به**۔ (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اس بلا سے محفوظ رکھا، جس میں یہ لوگ مبتلا اور ملوث ہیں۔ف)۔

(دنیا مرے آگے، ص ۳۲۴۔۳۲۵)

یہ سب بدعنوانیاں اس لیے ہوتی ہیں کہ سیکولر معاشرے میں صحیح وغلط، مفید ومضر کا فیصلہ عقل ہی کے پاس ہوتا ہے، لیکن ایسی صورت میں ایک طرف اس سے زندگی کی کوئی قدر صحیح سالم نہیں رہتی اور دوسری طرف چوں کہ ہر شخص کی عقل دوسرے سے مختلف ہے، اس لیے انسان متضاد آراء اور نظریات کی ایسی بھول بھلیوں میں پھنس جاتا ہے جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عقل وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد ہو، انسان اسے آزاد عقل سمجھتا ہے، لیکن درحقیقت وہ اس کی بہیمی خواہشات اور نفسانی اغراض کی غلام بن جاتی ہے، جو عقل کی غلامی کی بدترین شکل ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کی اصطلاح میں ایسی عقل کا نام "ہویٰ" (خواہش نفس) ہے، اور اسی کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: **و لو اتبع الحق اهواء هم لفسدت السمٰوٰت و الأرض و من فيهن**۔ اور اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کا تابع ہوجائے، تو آسمان وزمین اور ان کی مخلوقات میں سخت بگاڑ پیدا ہوجائے۔

(اسلام اور جدت پسندی از مفتی محمد تقی عثمانی: ۱۲)

☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلام کا وجود مدارس دینیہ کی مرہون منت

ہمارے اکابر کے اکابر نے تحریک ناکام ہونے پر واحد علاج اسلام اور دین کی بقاء کے لیے مکاتب کا قیام تجویز کیا تھا، آج پھر ملک اسی موڑ پر ہے کہ ہم قرآن پاک کی تعلیم، حدیث نبوی کی تعلیم، قال اللہ وقال الرسول کا اُمت میں عام ہونا، اسلام کا دُنیا میں باقی رہنا اگر ہے تو صرف مکاتب کے ذریعہ سے، مکاتب ہی کے ذریعہ سے اسلام اُمت میں آئے گا اور مکاتب ہی کے ذریعہ سے دعوت وتبلیغ اُمت میں عام ہوگی اور مکاتب ہی کے ذریعہ سے خانقاہوں کو فروغ ہوگا۔ (حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب دامت برکاتہم جانشین حضرت شیخ زکریاؒ)

"وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"
"اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنَ"

انٹرنیشنل میچ: وَن ڈے اینڈ فائیو ڈے

ڈاکٹر فخر الاسلام الہ آبادی

کیا آپ نے کبھی غور کیا؟:

علم الاعداد (Statisties) کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) دنیا میں کرکٹ پر ہر سال ۸۰/ ارب ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔
(۲) سال میں بارہ لاکھ گھنٹے کھیل ٹیلی ویژن پر دکھایا جاتا ہے۔
(۳) ۷ا ر کروڑ لوگ دنیا میں کرکٹ کھیل رہے ہیں۔
(۴) دنیا میں کرکٹ انڈسٹری کی مالیت گندم (گیہوں) کے بجٹ کے برابر ہے۔
(۵) ایک ورلڈ کپ پر خرچ ہونے والی دولت اگر مریضوں پر خرچ کی جائے تو دنیا کے تمام مریضوں کو ڈاکٹر، نرس اور دوائیں مفت مل سکتے ہیں۔
(۶) ایک ورلڈ کپ کے خرچ سے صحرائے عرب کو کاشتکاری کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔
(۷) ایک ورلڈ کپ میں جتنی رقم مشروبات، برگروں اور ہوٹلوں پر خرچ ہوتی ہے، اس رقم سے چالیس کینسر کے اسپتال بنائے جاسکتے ہیں۔ دنیا کے ایک تہائی بھوکوں کو ایک مہینہ کی خوراک دی جاسکتی ہے۔ سردیوں میں دنیا کے آدھے غریبوں کو سویٹر دیئے جاسکتے ہیں۔ پاکستان جیسے چار ملکوں کے قرض ادا ہوسکتے ہیں۔
(۸) ورلڈ کپ پر جتنی بجلی خرچ ہوتی ہے وہ چین جیسے ملک کی ۶/ ماہ کی برقی ضرورت پوری کرسکتی۔
(۹) ورلڈ کپ کے موقع جتنی شراب پی جاتی ہے وہ پورا برطانیہ مل کر پورے سال نہیں پیتا۔

(۱۰) ورلڈکپ سے عام شہریوں کا جتنا وقت ضائع ہوتا ہے، اگر آدمی دنیا پورا مہینہ چھٹی کرے، تو بھی اتنا وقت ضائع نہیں ہوگا۔

ذرا بتلایئے! کیا یہ اسراف نہیں ہے؟ اور کیا اسراف اور فضول خرچی کرنے والوں کو اللہ نے شیطان کا بھائی نہیں کہا ہے؟ اور کیا ''اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنَ'' خود قرآن میں موجود نہیں؟

پھر اس قسم کے کھیلوں میں کسی مسلمان کا دلچسپی لینا، کھیلنے والوں کی تعریف کرنا، ایسا کھیل دیکھنا، اور اس میں اپنا وقت اور روپیہ برباد کرنا، کیا کسی مسلمان کا شیوہ ہوسکتا ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

دینی مدارس انسانیت سازی کے کارخانے

یہ بہت بڑی کارگاہ ہے جہاں آدم گری و مردم سازی کا کام ہوتا ہے، جہاں دین کے داعی اور اسلام کے سپاہی تیار ہوتے ہیں، یہ عالم اسلام کا پاور ہاؤس (بجلی گھر) ہیں، جہاں سے اسلامی آبادی بلکہ انسانی آبادی میں بجلی تقسیم ہوتی ہے، یہ وہ کارخانہ ہے جہاں قلب و نگاہ اور ذہن و دماغ ڈھلتے ہیں، یہ وہ مقام ہے جہاں سے پوری کائنات کا احتساب ہوتا ہے اور پوری انسانی زندگی کی نگرانی کی جاتی ہے، ان مدارس کا تعلق کسی تقویم، کسی تمدن، کسی عہد اور کسی کلچر یا کسی زبان و ادب سے نہیں کہ اس کی قدامت کا شبہ یا اس کے زوال کا اندیشہ ہو، بلکہ اس کا تعلق براہ راست حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور نبوت سے ہے، جو عالم گیر بھی ہے، زندۂ جاوید بھی اور اس کا تعلق انسانیت سے جو ہر دم جواں ہے اور اس زندگی سے جو ہمہ وقت رواں دواں ہے، مدرسہ ایسی جگہ ہے جہاں نبوت و رسالت کی ابدیت اور زندگی کا نمونہ اور حرکت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ (مفکر اسلام حضرت سید ابوالحسن علی ندویؒ)

دورِ حاضر میں دینی تعلیم کی صورتیں

مولانا فیض الرحمٰن عثمانی

دینی تعلیم کی تین شکلیں ممکنہ طور پر ہو سکتی ہیں، ان میں سے ایک شکل تقریباً ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے، اسے ہر صورت باقی رکھنے اور مزید بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ دونئی شکلوں کو بروئے کار لانا دینی ضرورت ہے۔

دینی تعلیم کی پہلی شکل:

دینی تعلیم کی پہلی شکل سے میری مراد اسلامی و عربی علوم کی تعلیم کا وہ نظام ہے جو دینی مدارس و معاہد کے نام سے معروف ہے، دینی مدارس اور اسلامی معاہد کے اس عظیم الشان سلسلے کی برکت اور افادیت ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، ان دینی اداروں سے مجھ ناچیز کی وابستگی تقریباً چالیس سال سے ہے، گزشتہ بیس برس سے تو ایک دینی تعلیمی ادارے (ادارۂ علوم اسلامی، اسلام آباد) کی خدمت مستقل طور پر بندہ کے سپرد ہے، اس سے قبل تقریباً بیس سال کا عرصہ حصولِ علم اور مدارس و مساجد کے ساتھ وابستگی میں گزرا، اس دوران اندرون و بیرونِ ملک مدارس اور عصری تعلیمی اداروں کو دیکھنے، ان کے طلبا اور فضلا سے ملنے، اور جن ممالک میں جانا نہیں ہوا، ان کے دورے کرنیوالے ثقہ اہلِ علم سے وہاں کے حالات سننے سے یہ ناچیز اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اسلامی اور عربی علوم میں پختگی کا جو سامان دینی مدارس میں موجود ہے وہ کسی کالج اور یونیورسٹی میں نہیں۔

مدارس کے نصاب و نظام میں تبدیلی؟

جہاں تک مدارس کے نظام میں مزید بہتری لانے کی بات ہے تو اس سلسلے میں خود دینی مدارس سے وابستہ بزرگ و اکابر حضرات مدارس کے نظام و نصاب میں تبدیلی کا وقتاً فوقتاً مشورہ دیتے چلے آئے ہیں، تاکہ نتائج و ثمرات کے لحاظ سے یہ ادارے ہر دور کے تقاضوں پر پورا اتر سکیں لیکن آج کل جو ایک ہوا چل پڑی ہے کہ ہر کس و ناکس اہلِ مدارس کو اصلاحِ نظام

ونصاب کے مشورے دے رہا ہے، اس کے پیچھے عموماً مثبت فکر کارفرما نہیں ہوتی۔

دینی علوم کے نصاب کی اصلاح کا مشورہ دینے والے لوگوں کے تین طبقات ہیں:

(۱)...... وہ حضرات علمائے کرام جن کا دینی علوم اور دینی مدارس کے ساتھ براہ راست تعلق ہے اور انہیں دینی علوم کی تعلیم و تعلم کا باقاعدہ تجربہ حاصل ہے۔

(۲)..... وہ مخلص اور دین کا درد رکھنے والے مسلمان جو دینی علوم سے براہ راست کوئی واقفیت نہیں رکھتے اور انہیں اس میدان کا کوئی تجربہ بھی نہیں۔

(۳).... وہ لوگ جنہیں دینی مدارس، دینی علوم اور علماء دین کے ساتھ بغض وعناد ہے۔

مذکورہ بالا تیسرا گروہ دینی مدارس کو وقتاً فوقتاً یہ تجویز دیتا رہتا ہے کہ:

ان اداروں میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انجینئرنگ اور طب وغیرہ کی تعلیم دی جائے اور دیگر مختلف ہنر بھی سکھانے کے انتظامات کئے جائیں تاکہ علم سے فراغت کے بعد ان اداروں سے نکلنے والے لوگ معاشرے پر بوجھ نہ بنیں اور اپنی روزی کما سکیں۔ اس طبقہ کے پروپیگنڈے سے دینی علوم اور مدارس دینیہ سے براہ راست واقفیت نہ رکھنے والے بعض مخلص مسلمان بھی متاثر ہو کر دینی مدارس کو اس قسم کے مشورے دینے لگے ہیں۔

یہ باتیں بظاہر جتنی پرکشش اور درست نظر آتی ہیں درحقیقت اتنی ہی نادرست اور ناقابل عمل ہیں کیوں کہ دینی علوم پڑھنا پڑھانا بجائے خود ایک تخصص (specialization) ہے۔ یہ اپنے ساتھ ہلکے پھلکے عصری علوم یعنی آرٹس کے مضامین کو تو برداشت کر لے گا، مگر انجینئرنگ، طب اور دیگر فنون کا بھاری بوجھ اس نظام کو یکسر بگاڑ دے گا۔

کیا کسی میڈیکل کالج والوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے یہاں انجینئرنگ پڑھائیں؟ اسی طرح کسی انجینئرنگ کالج میں طب پڑھانے پر کبھی زور دیا گیا ہے؟ آخر دینی مدارس ہی کو یہ مشورہ کیوں دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے یہاں سائنسی علوم پڑھائیں!

اصل تجویز تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ حکومت کی سرپرستی میں چلنے والے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں عصری علوم کے ساتھ ساتھ بقدر ضرورت دینی علوم پڑھانے کا بندوبست بھی کیا جائے۔

اس تجویز کی یہ بات تو بہت ہی عجیب ہے کہ صرف دینی علوم پڑھ کر دینی خدمت انجام دینے والے لوگ معاشرے پر بوجھ ہوتے ہیں۔

کسی کالج سے گریجویشن کرنے میں اپنا وقت، توانائی اور پیسہ خرچ کرنے کے بعد اگر کوئی گریجویٹ کسی دفتر میں کلرک بن کر وہاں سے تنخواہ لیتا ہے تو کیا وہ معاشرے پر بوجھ ہوتا ہے؟ ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کرنے والا کوئی ڈاکٹر جب کسی ہسپتال میں ملازم ہو کر تنخواہ لیتا ہے تو کیا وہ معاشرے پر بوجھ ہوتا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو پھر کئی سال تک دینی علوم پڑھنے والا طالب علم جب فراغت کے بعد کسی مسجد میں خطابت یا مدرسہ میں تدریس کر کے تنخواہ لیتا ہے تو وہ آخر معاشرے پر بوجھ کیوں ہوتا ہے؟ یہ کتنی بے وزن اور بے دلیل بات ہے! مگر بظاہر بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ اس قسم کی باتیں آئے دن کرتے رہتے ہیں، اصل میں یہ لوگ کہنا تو یہ چاہتے ہیں کہ مسجد اور مدرسہ کوئی ضروری چیز نہیں اور ظاہر ہے کہ غیر ضروری چیز پر خرچ کرنا معاشرے پر بوجھ کے سوا کچھ نہیں سمجھا جاسکتا۔

اب میں ان حضرات کی رائے پیش کرنا چاہوں گا جن کا دینی مدارس اور دینی علوم کے ساتھ براہ راست تعلق ہے، یہ حضرات بھی مدارس کے نصاب و نظام میں تبدیلیوں کی بات عرصہ سے کر رہے ہیں مگر یہ حضرات جس قسم کی تبدیلی چاہتے ہیں وہ تعمیری تبدیلی ہے۔ میں اس مقام پر پاکستان کے چوٹی کے دو علماء کرام کی آراء نقل کرنے پر اکتفا کروں گا۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ کی رائے:

''اگر ہمارے متقدمین اپنے زمانے کی ضروریات کے پیش نظر فارسی زبان کو اپنا سکتے ہیں، یونانی منطق و فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم کو نصاب کا ایک بڑا جز بنا سکتے ہیں تو ان کا اتباع آج اس میں نہیں کہ ہم اس وقت بھی وہی منسوخ شدہ سکے لے کر بازاروں میں پھریں، بلکہ وقت کی ضرورت کے مطابق انگریزی زبان اور فنون جدیدہ کو پڑھنا پڑھانا وہی درجہ رکھے گا، جو اس زمانے میں فارسی زبان اور یونانی فلسفہ کا تھا، اگر آج اس حقیقت کو سمجھ کر ہمارے علما فارسی زبان کی جگہ انگریزی کو اور یونانی فلسفہ کی جگہ جدید سائنس اور فلسفہ کو دے دیں تو اس میں نہ علوم دینیہ کی تعلیم میں کوئی غلط تصرف ہے اور نہ ہی یہ اسوۂ اسلاف سے مختلف ہے''۔

(طلبہ علم دین سے خطاب، شائع کردہ: ادارۂ اسلامیات)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کی رائے:

''مدارس کے نصاب تعلیم کی تجدید و ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس لئے نہیں

کہ وہ اپنے زمانے میں کافی نہ تھا یا صحیح استعداد پیدا کرنے سے قاصر تھا بل کہ مزید علوم جدیدہ یا معلومات عامہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ وقت کے تقاضے بدل گئے، طبیعتوں کے سانچے بدل گئے، اذواق وافکار میں فرق آ گیا، عبارتی دقت اور موشگافیوں کے لیے مزاجوں میں صلاحیت نہیں رہی۔۔۔ اگر غور کیا جائے تو ہمارے مدارس میں بیس بائیس علوم کی تقریباً سو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان پر جہاں تک راقم الحروف نے غور کیا بمشکل دس کتابیں ایسی ہیں جن کا ہمیں بدل نہیں ملے گا۔ بقیہ سب کا نعم البدل قدماء کی کتابوں میں مل سکتا ہے۔ ہم ان قدیم علوم کو ہٹانا نہیں چاہتے بل کہ ان علوم میں صحیح مہارت وقابلیت پیدا کرنے کے لیے بہتر کتابوں کو داخل کرنا چاہتے ہیں اور یہ ان علوم اسلامی کی خیر خواہی کے لیے چاہتے ہیں اور امت حاضرہ کے مفاد کے پیش نظر یہ خواہش رکھتے ہیں۔ جدید نصاب تعلیم میں جو بنیادی خطوط ہیں، میرے ناقص خیال میں اس کے تین نقطے ہیں!

(الف) تخفیف: یعنی نصاب مختصر ہو جس کی فراغت وحصول میں بہت زیادہ عرصہ کی ضرورت نہ ہو۔

(ب) تیسیر: یعنی نصاب میں مندرجہ کتابیں سہل وسلیس زبان میں ہوں پیچیدہ ودقیق نہ ہوں۔

(ج) محو واثبات یا اصلاح وترمیم: یعنی بعض غیر اہم فنون کو ساقط کر کے جدید مفید علوم کا اضافہ ہو۔ اس ماحول میں اگر ہم اب بھی ان غیر اہم وسائل پر جمے رہیں گے تو علوم اسلامیہ سے توجہات ہٹ جائیں گی اور ہمارا یہ طرز عمل ہمارے اکابر وسلف کی اس ''تراث فاخر'' اور اس علمی ثروت وسرمایہ کو فنا کے گھاٹ اتار دے گا''۔

(حوالہ: میری علمی ومطالعاتی زندگی، مولانا عبدالقیوم حقانی)

آپ نے ان جلیل القدر علماء کرام کی آراء ملاحظہ فرمائیں، یہ اور اس کی قسم کی مبنی بر تجربہ آراء جو وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہتی ہیں، ان کے نتیجے میں جدید تقاضوں کا احساس بیدار ہوا ہے اور وفاق المدارس العربیہ سمیت دیگر تنظیمات مدارس کی طرف سے نظام ونصاب پر مسلسل نظر رکھنے کے لیے جید علماء پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی ہوئی ہے، اس سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ مسلسل غور وخوض کے نتیجے میں تبدیلیوں کا عمل جاری وساری رہے گا اور دینی مدارس مزید بہتر نتائج کے ساتھ اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے رہیں گے۔

احقر موجودہ مدارس کے نصاب میں کسی بڑی تبدیلی کا قائل نہیں، اس معنی میں کہ

ان مدارس میں سائنسی علوم وفنون کے تخصص کا انتظام کیا جائے یا میڈیکل وانجینئرنگ کی تعلیم دی جائے یا موجودہ نصاب پڑھانے کے دوران ایف، اے اور بی اے کے سرکاری امتحانات دلائے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ عمل دینی علوم میں رسوخ کے راستے میں یقینی رکاوٹ بن جائے گا اور دینی مدارس اپنی خصوصیت سے محروم ہو جائیں گے، جس کا ذکر میں نے آغاز میں کیا ہے، یہ ناچیز تبدیلی کے اس انداز کو غیر صحت مند تبدیلی سمجھتا ہے اور اسے یہ خدشہ لاحق ہے کہ یہ عمل دینی علوم میں استعداد کو ناقابل یقین حد تک کمزور کر دے گا، بندہ اس خدشہ کا اظہار مختلف مواقع پر اہل علم کے سامنے کرتا رہتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیا ہونا چاہیے؟ ناچیز کے خیال میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی آراء کی روشنی میں صرف جزوی اور بقدر ضرورت ترمیم وتبدیلی پر انحصار کیا جائے، جو "تخفیف، تیسیر اور محو واثبات" کے تین مظاہر کی شکل میں ہو۔

چناں چہ دینی مدارس کے موجودہ نظام میں صرف چار مضامین کا اضافہ کیا جائے:

(۱) تاریخ۔ (۲) تقابل ادیان۔ (۳) انگریزی زبان۔ (۴) معاشیات۔

مگر ان مضامین کے امتحانات سرکاری بورڈ یا کسی یونیورسٹی کے تحت نہ دلائے جائیں اس لیے کہ اس طرح درس نظامی کے لیے مقررہ وقت میں سے، بہت سا وقت امتحان کی تیاری اور امتحان دینے کے لیے صرف کرنا پڑے گا، جو بالآخر دینی علوم میں ناپختگی کا باعث بنے گا۔

دینی تعلیم کی دوسری شکل:

دوسری شکل یہ ہے کہ اگر اہل مدارس دینی علوم میں رسوخ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ طلبا کو ایف، اے۔ بی، اے اور ایم اے کرانے کی واقعی خواہشمند ہوں، تو اس کے لیے ایک نیا نظام ترتیب دینا پڑے گا، جس کا اجمالی خاکہ احقر کے خیال میں یہ ہے:

(۱) دینی مدارس کا جو موجودہ سلسلہ چل رہا ہے، اسے باقی رکھتے ہوئے ان مدارس میں مستقل شعبوں کی حیثیت سے یا الگ سے کچھ نئے اداروں کی داغ بیل ڈالی جائے۔

(۲) ان اداروں میں کم از کم میٹرک پاس طلبا کو داخلہ دیا جائے یا طلبا کے لیے ان

اداروں کے اندر میٹرک تک تعلیم کا انتظام موجود ہو۔

(۳) ان اداروں میں تعلیمی سال کا دورانیہ مدارس کے موجودہ تعلیمی سال سے لمبا ہو، اس سلسلے میں تجویز یہ ہے کہ شوال کے پہلے عشرے میں ہی تعلیمی سال کا آغاز ہو جائے اور شعبان کے آخر تک جاری ہے۔

(۴) دینی اور عصری علوم کی تدریس اور مذاکرے کے لیے الگ الگ وقت مقرر ہو۔

(۵) پورے کورس کے لیے میٹرک کے بعد آٹھ یا دس سال کا دورانیہ مختص کیا جائے۔

(۶) اس قسم کے کسی ادارے کے انتظامی امور میں فیصلوں کا اختیار جن افراد یا جس فرد کو حاصل ہو اس میں تین شرطیں لازمی طور پر موجود ہوں:

(الف) دینی علوم میں پختگی کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے واقفیت۔

(ب) احکام شریعت کی مکمل پیروی اور برے اور قابل ترک کاموں سے اجتناب۔

(ج) منتظمین میں سے چند یا کوئی ایک ان ذمہ داریوں کو ''فل ٹائم جاب'' کے طور پر انجام دیں محض جز وقتی سرپرستی سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔

(۷) مدرسین کے انتخاب میں دو شرطیں لازمی طور پر ملحوظ رہیں:

(الف) ان میں شریعت کے احکام پر عمل کا اہتمام ہو اور منکرات ونواہی سے بچے رہنے کا التزام۔ اس سلسلے میں عصری مضامین کی تعلیم دینے والے مدرسین کو قطعاً کوئی رعایت نہ دی جائے۔

(ب) متعلقہ مضامین پر اساتذہ کو عبور حاصل ہو اور وہ مطلوبہ سند کے بھی حامل ہوں۔

زیر بحث دینی تعلیمی اداروں کے منتظمین و مدرسین کے لیے جن شرائط کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، بعض جدت پسند طبائع کو یہ شرائط ناگوار گزرتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شرائط تجربات کے بعد عرض کی جارہی ہیں، کیوں کہ اس سے پہلے جہاں جہاں اس قسم کے ادارے قائم کرنے کی کوشش کی گئی، اور ان میں ذکر کردہ شرائط ملحوظ نہیں رکھی گئیں وہ ادارے یا تو بند ہو گئے ہیں، یا ان سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوئے، اور زیادہ ادارے مآل کار محض عصری علوم پڑھانے تک محدود ہو گئے ہیں۔

مطلوبہ نتائج سے میری مراد بیک وقت تین باتوں کا پایا جانا ہے:

(۱) دینی علوم کی پختگی۔ (۲) عقائد و افکار کی درستگی اور اعمال صالحہ کا اہتمام۔

(۴) عصری علوم میں نمایاں کارکردگی۔

ذکر کردہ شرائط کے حوالے سے بعض حضرات کا علماء کرام پر یہ اعتراض ہے کہ ''علما اپنے آپ کو دین کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں اور منتظمین کے لیے اس قسم کی شرائط کا عائد کرنا اسی ''ٹھیکیداری'' اور ''اجارہ داری'' کے جذبے کا اظہار ہے یہ حضرات کسی کی ماتحتی میں کام کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں''۔

اس پہ بندہ یہ عرض کرتا ہے کہ علماء دین کے ٹھیکیدار نہیں لیکن بعض بزرگوں کے بقول دین کے پہرے دار ضرور ہیں اور یہ ٹھیکیداری نہیں پہرے داری کے جذبے کا اظہار ہے، پہرے داری کا ہمہ وقتی تجربہ انہیں یہ بتاتا ہے کہ مطلوبہ شرائط کی پاسداری کیے بغیر جہاں بھی اس قسم کے دینی تعلیمی ادارے قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

دینی تعلیم کی جس صورت کا میں اب ذکر کر رہا ہوں، یہ صورت بعض مقامات پر روبہ عمل ہے۔ان میں سے بعض کوششوں سے بندہ براہ راست واقف ہے:

(۱) ان میں سے ایک کوشش ''جامعۃ الرشید'' کراچی میں ''کلیۃ الشریعۃ'' کے عنوان سے موجود ہے اس کلیہ میں گریجویٹ طلبا کو داخلہ دیا جاتا ہے، ان کے لیے ایک نیا کورس ترتیب دیا گیا ہے اور اس کلیہ کے منتظمین میں مطلوبہ شرائط بدرجہ اتم موجود ہیں، مشاہدہ کی بنیاد پر عرض کرتا ہوں کہ ''جامعۃ الرشید'' کے ''کلیۃ الشریعۃ'' کے نوجوان علماء الحمدللہ علمی رُسوخ، عصری ضرورتوں سے آگاہی، دردِدل اور قوت کار کی دولت سے پوری طرح بہرہ اندوز ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ میں مزید برکتیں عطا فرمائے اور ان کے کاموں کو امت کے لیے زیادہ سے زیادہ منفعت بخش بنائے اور انہیں اجر جزیل سے نوازے، مجھے امید ہے کہ ان کی کوششیں ان کے لیے پیچیدہ راہیں ہموار کریں گی۔

(۲) برطانیہ میں بھی دو ایسے ادارے دیکھنے کی سعادت میسر ہوئی جن میں دینی اور عصری علوم کو یکجا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، ان میں سے پہلا ادارہ تو ابراہیم کمیونٹی کالج لندن ہے مجھے اس کالج کی انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ سے ملنے، نصاب پر وقفے وقفے سے طویل مناقشہ کرنے اور طلبہ کا امتحان لینے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، تعلیم کی مدت اور دورانئے کی کمی اور تنگی کے باوجود یہ حضرات ''اے لیول'' کے ساتھ شرح ابن عقیل تک اسلامی اور عربی علوم پڑھاتے ہیں۔

میرے خیال میں ایک غیر معمولی کارنامہ ہے اگلے سال سے یہ کالج ڈگری لیول اور اسی کے ساتھ مشکوٰۃ شریف تک کی تعلیم شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کے بعد ایم اے تک عصری تعلیم کے ساتھ دورۂ حدیث تک دینی تعلیم کا پروگرام بھی پیش نظر ہے۔

(۳) انگلینڈ میں نوٹنگھم کے مقام پر ایک ادارہ ہے جس کا نام "جامعۃ الہدیٰ" ہے، یہ طالبات کا ایک ایسا رہائشی تعلیمی ادارہ ہے جس میں اے لیول تک دینی اور عصری علوم ایک ساتھ پڑھائے جاتے ہیں، مجھے اس ادارہ کے نصاب پر نظر ثانی کرنے والی ایک طویل میٹنگ میں شرکت کا موقع ملا ہے لیکن یہاں کے تعلیمی ماحول اور نظام کو قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا تاہم بعض طالبات کے سرپرستوں اور ایک ثقہ عالم دین کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ انگلینڈ میں طالبات کے لیے قائم دینی تعلیمی اداروں میں جامعۃ الہدیٰ سرفہرست ہے۔

(۴) اسی فہرست میں ایک نام "ادارہ علوم اسلامی، اسلام آباد" کا ہے، جس کی تاسیس اور گذشتہ بیس سال سے اس کی خدمت کی سعادت اس ناچیز کو حاصل ہے۔ یہ ادارہ اسلام آباد سے مری جاتے ہوئے ٹول پلازہ سے ذرا پہلے مری ہائی وے پر سوا نو ایکڑ زمین کے وسیع رقبے پر قائم ہے۔ اس ادارہ میں بالکل نئی تشکیل کے ساتھ چھٹی جماعت سے بی اے تک عصری علوم اور اعدادیہ سے دورۂ حدیث تک دینی علوم ایک ساتھ پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ ادارہ بیک وقت وفاق المدارس العربیہ پاکستان اور فیڈرل بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، اسلام آباد کے ساتھ ملحق ہے۔ چناں چہ اس میں وہ مکمل نصاب پڑھایا جاتا ہے جو وفاق المدارس العربیہ کے تحت دیگر دینی مدارس میں رائج ہے، اور چھٹی سے بی اے تک حکومت کی طرف سے مقرر کردہ نصاب کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کورس کے لیے ادارہ پرائمری پاس حافظِ قرآن طلبہ سے گیارہ سال اور میٹرک پاس طلبہ سے نو سال کا وقت لیتا ہے۔

ان اداروں کی کارکردگی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دینی اور عصری علوم کو اگر نئی تشکیل کے ساتھ نسبتاً زیادہ وقت میں ضروری شرائط ملحوظ رکھتے ہوئے پڑھایا جائے تو یہ ممکن ہے اور یہ وقت کی ضرورت بھی ہے، البتہ اس سلسلے میں، احقر یہ بات پھر عرض کرنا چاہے گا کہ اس کے لیے دینی مدارس کے موجودہ نظام کو نہ چھیڑا جائے بل کہ انہیں اپنے حال پر معمولی تبدیلیوں کے ساتھ جاری رکھا جائے۔ نیا تجربہ الگ سے کیا جائے، اس کے لیے وہ ادارے مثال بن سکتے ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا۔

دینی تعلیم کی تیسری شکل:

اب میں دینی تعلیم کی تیسری شکل کے بارے میں اپنی معروضات پیش کروں گا، وہ شکل یہ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں، وہاں ابتدا سے لے کر یونیورسٹی تک عصری تعلیم کے معیاری ادارے قائم کئے جائیں، جن میں مروجہ عصری نصاب کی تعلیم دی جائے (باستثناء ان مضامین کے جن کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے) اور ساتھ ساتھ ضروری دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہو۔ اس قسم کے اداروں کی انتظامیہ میں جن افراد کو فیصلوں کا اختیار حاصل ہو، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین اسلام کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی رکھتے ہوں، اپنی زندگیوں میں انہوں نے دین کو نافذ کیا ہو۔ اس قسم کے اداروں کا مقصد عصری علوم میں استعداد پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اچھے مسلمان پیدا کرنا ہے، اس لیے منتظمین میں مذکورہ بالا شرائط کا موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔ پھر ایسی شرائط کے حامل افراد جز وقتی ذمہ داری ادا کرنے پر اکتفاء نہ کریں بل کہ کم از کم کوئی ایک فرد کل وقتی جاب کی طرح اپنے ذمہ داری پوری کرے، تاکہ ادارے کے مقصد تاسیس کی صحیح نگہبانی ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ نگہبانی ہمہ وقتی نگرانی کے بغیر کا حقہ نہیں ہو سکتی۔

ایسے اداروں میں مدرسین کے انتخاب میں بھی دین کو بنیادی شرط کا درجہ دینا ضروری ہے۔ عقیدہ، علم اور عمل، تینوں اعتبار سے مدرسین کو دین اسلام کی حسین تعلیمات کا بہترین نمونہ ہونا چاہئے، کیوں کہ اس قسم کے اداروں میں باقاعدہ دینی تعلیم نہیں ہوگی، اس لیے طلبہ کو سیرت وکردار کے اعتبار سے اچھا مسلمان بنانے کا کام اساتذہ کو اپنے احسن کردار کے ذریعہ کرنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مدرسین اپنے متعلقہ مضامین میں بھی ماہر ہوں، اعلیٰ ترین عصری اداروں کے ہم پلہ وہم معیار ہوں، اس سلسلے میں انتظامیہ کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ایسے اوصاف کے حامل اساتذہ کو معاصر تعلیمی اداروں کے مدرسین سے قدرے زیادہ مشاہرہ دیں اور انہیں وہ قانونی تحفظ بھی فراہم کریں جو اس معیار کے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو حاصل ہے۔

تعلیم کی یہ تیسری شکل وقت کی بڑی اہم اور بنیادی ضرورت ہے، پورے عالم میں مسلمانوں کی نسل فکری یلغار کی زد میں ہے۔

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے

مولانا افتخار صاحب بستوی
استاذ جامعہ اکل کوا

اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعے انسانوں کو جو دین کامل اسلام کے نام سے دے چکا ہے اس میں زندگی کی مکمل رہبری کے لیے بھرپور مواد موجود ہے دنیا کے کسی مذہب وقانون میں انسانیت کی پیاس بجھانے اور زندگی کی خار دار شاہ راہوں میں دیا جلانے کے لیے وافر مقدار میں تیل بھی نہیں یہ بات دنیا کے مختلف مذاہب کے نمائندہ افراد کو یقین واذعان کی حد تک معلوم ہے، اس لیے وہ آئے دن نت نئے طریقوں سے اسلام کی بے پناہ پنہایوں کو تنگ ثابت کرنے اس کے مفہوم میں غلط معنی ڈالنے اس کے سانچے کو بدبودار بنانے اور اس کے پھول کانٹوں کا مخلوطہ کہنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔

ابھی ماضی میں امریکہ کے عراق پر حملہ کرنے میں جو حقیقت سامنے لائی گئی تھی کہ عراق میں WMD (یعنی وسیع پیمانے پر تباہ کن ہتھیار) وافر مقدار میں ہیں یہ بات نہیں تھی بل کہ اس نے استعماریت کے اعلی اغراض ومقاصد کی خاطر عراق پر حملہ کیا تھا اور اب تک انہیں مقاصد کے صد فیصد حصول کی خاطر مسلسل فوجیں بھیج کر وہاں اپنا تسلط جمائے ہوئے ہے۔

اس کا مقصد وہی ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ امریکی ویورپین مذاہب ہی زندگی کی اعلیٰ قدروں کو زندہ کر کے چہار دانگ عالم میں زندگی کی روح پھونک سکتے ہیں، اور طاقت وقوت کا نشہ اور دولت وثروت کی ریل پیل ہی کامیابی وترقی کی ضمانت ہے۔ حالاں کہ دنیا کے اعلی دماغوں نے یہ نظریہ ماننے سے یکسر انکار کر دیا ہے، اور آئے دن اسلامی بیداری کی روح دنیا کے مختلف گوشوں میں اور عالم اسلام کے مختلف خطوں میں پروان چڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

افغانستان کے کوہ و دمن میں رہنے والے سخت جان مسلمان، اسلام پسند افغانی ،سوڈان کے جاں گسل حالات سے نہ گھبرانے والے اسلام پسند نوجوان، صومالیہ کے بیدار مغز اور روح کو غذا دینے والے بیدار مسلمان، شام و مصر بڑھتے اسلامی رجحان رکھنے والے باشندے اس بات کا پختہ ثبوت ہیں کہ تم اگر مسلمانوں کے مسلکی اختلافات کو ہوا دے کر مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرو گے اور اپنی اس نوع کی گوناگوں تحریکوں اور سرگرمیوں سے اسلام کے اعلیٰ زندہ مذہب ہونے کی حقیقت کو پاؤں تلے روندنے کی اسکیمیں چلاؤ گے، تو ہم بھی چین سے بیٹھ کر تماشہ بینوں کی طرح اپنے مذہب اسلام کی عزت وعظمت کو لٹتا ہوا دیکھنا گوارہ نہیں کر سکتے۔ ہم عالم اسلام میں چین سے جینا پسند کرتے ہیں اور چین سے جینے کا درس دے کر بندگان خدا کو خاموش و بے جان خداؤں کی غلامی سے نکال کر خدائے واحد کی دہلیز پر سر جھکانے کا گر سکھاتے رہیں گے۔ ہم لوگوں کو حقیقت سے روشناس کرانے کے لیے مال واسباب اور مادی قوتیں کیا ہیں جان تک کی بازی لگا دیں گے۔ نہ ہم تمہارے غلط پروپیگنڈوں کی بارش کو خاطر میں لائیں گے اور نہ تمہارے دندناتے فوجیوں کے ناپاک قدموں کی کھڑکھڑاہٹ سے ڈریں گے۔ تم اسلام کا مفہوم بدل دو، ہم اسلام کا صحیح مفہوم پیش کر کے دلوں کو بدل دیں گے۔ تم خدا کی سرزمین پر ناجائز قبضہ جما کر خدا کی سرزمین کو ان کے حوالے کرو گے، تو ہم خدا کے بندوں کے دلوں پر جائز قبضہ جما کر خدا کی سرزمین کو ان کے حوالے کریں گے ہم خدا کے آستانے پر ہی سر جھکانے کا گر سکھائیں گے، اسی میں رفعت شان کا بول بولنا ترقی کا راز جانیں گے، تم ہماری عبادتوں کو دہشت گردی کی حرکتیں کہتے نہیں تھکو گے اور ہم خدا کے آستانے پر سجدہ ریزی سے نہیں تھکیں گے، اور عالم اسلام بل کہ دنیا کے ہر بوڑھے بچے مرد وعورت، جوان وناتواناں کو بتا دیں گے ۔

کسی کا آستانہ ہے اتنا اونچا
کہ سر جھک کر بھی اونچا ہی رہے گا
ہنسے جانے سے جب تک تم ڈرو گے
زمانہ تم پر ہنستا ہی رہے گا

تم ایک وقت تھا کہ کئی مقاصد لے کر اکتوبر ۲۰۰۱ء افغانستان پر یورش کے لئے کھڑے ہوئے تھے، جس کا نام تم نے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے نشر واشاعت اور صحافت کی

دنیامیں Enduring Freedom Opration آپریشن پائیدار آزادی رکھتا تھا اور مقاصد کی تشریح یوں کی تھی (۱) اسامہ بن لادن کی موت یا گرفتاری۔(۲) القاعدہ نیٹ ورک کا مکمل صفایا۔(۳) طالبان حکومت کا خاتمہ۔(۴) اور مرکزی حکومت کا قیام ہمارے قابل ستائش ارادے ہیں۔لیکن تم الحمدللہ اپنے عزم وارادے مکمل ناکام ثابت ہوئے، تم افغانستان میں القاعدہ نیٹ ورک کے صرف ۲۵ رفیصد کو تباہ کر سکے۔اور ۷۵ رفیصد نیٹ ورک اور افرادی قوت پر تمہارا کوئی بس نہ چل سکا، امریکہ ہی کے اعداد وشمار کے اداروں اور پینٹا گان کے مطابق صرف ۸۰۰ رافغان کی جانیں گئیں اور ۵۰۰ رافغان اور عرب مجاہدوں کو پکڑ کر گوانتا ناموں بے جیل کے حوالے کیا گیا۔تمہارے شمالی اتحاد نے زوردار دعویٰ کیا تھا کہ طالبان کا قتل عام کرنا ہے لیکن وہ اس میں یکسر فیل رہا۔

ڈونلڈ رمزفیلڈ نے ایک وقت بڑے کروفر کے ساتھ امریکی وزارت دفاع کا عہدہ اس مقصد سے قبول کیا تھا کہ افغانستان میں بڑی بڑی قوتیں دفن کرنا ہے لیکن جب وزیر دفاع نے اپنے عہدے سے استعفیٰ پیش کیا تو اس سے ایک ماہ پیشتر یہ اعتراف درج کرایا کہ امریکہ نے افغانستان میں اپنی قبر بنانے کے لیے جگہ مختص کرالی ہے۔

یہ سب وضاحتیں اس بات کا پختہ اعلان ہیں اسلام کے مفہوم کو زوردار آوازوں سے بدل کر اسلام اور عالم اسلام کا خاتمہ ایک ناممکن امر ہے، امریکہ اور یورپ کے یہودی ونصرانی اپنی ناپاک سازشوں اور خطرناک ریشہ دوانیوں سے خلق خدا پر کتنا ہی ظلم کرلیں اور اسلام اور اہل اسلام کو سرزمین عالم کی خطرناک مخلوق ثابت کرلیں لیکن دنیا کی آنکھ میں دھول ہرگز نہیں جھونک سکتے۔ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟ ظالم کی کارستانیاں اور افسانے کیا ہیں اور مظلوم کے درد کی داستان کیا؟ سب خلق خدا کو معلوم ہے۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا ؟
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا ؟

تم اکتوبر ۲۰۰۱ء میں افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے کمر بستہ کھڑے ہوئے تو ہوش مند افغان طالبان نے دوسال کی مکمل خاموشی کے بعد ۲۰۰۳ء میں اپنی زندگی کا زندہ ثبوت دینے کے لئے موسم گرما کو چنا، اسی گرمی کے تپتے موسم میں انہوں نے نہایت جاہ وجلال سے ایک نئی حکمت عملی اختیار کی، ۵۰ رارکان تک کے گروہوں میں منقسم

ہو کر شیروں کی طرح دہاڑتے ہوئے حملہ آور ہوئے، غیر ملکی این جی اوز (Ngoes) کے ایسے مراکز پر نا گہاں حملے کرتے جوان کے خیال میں در پردہ دوسرے مخالفانہ اور منافقانہ کام بھی کر رہی تھیں۔ حملہ کر کے فوراً وہ کہیں سے کہیں چلے جاتے۔ ملا عمر نے مزاحمت کو بڑی منظم شکل دے کر طالبان کے پانچ آپریشنل زونز بنائے، ہر زون میں ایک کمانڈر رہوتا۔ ابھی ۲۰۰۶ء میں ان گروہوں نے ہلمند، قندھار، زابل، غزنی، پکتیا، خوست، کنڑ، لوگر، اور نورستان میں کارروائیاں بھی کیں اور عملی طور پر وہاں موجود بھی رہے، اب موجودہ صورت حال بتاتی ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں امریکی فوجیں اور ناٹو کے لوگ موجود ہیں اور قصبات، اور دیہات اور مختصر شہروں میں طالبان کی اپنی حکومت قائم ہے۔ تم نہ تو ملا عمر کو گرفتار کر سکے، نہ اُسامہ بن لادن کے بارے میں کوئی پتہ بتا سکے، طالبان کی بڑی تعداد ہوش مندی سے پشتون آبادی میں غائب ہو گئی۔ جب امریکہ نے اپنی شکست کا اندازہ کر لیا تو اس کو مختلف بہانوں اور گونا گوں تدبیروں سے پردہ میں رکھنا چاہا اور الٹے مسلمانوں پر ظلم وستم کا پہاڑ توڑنا شروع کیا اور ایسی ایسی نازیبا حرکتیں کرنا شروع کیں اور شرم خود شرمندہ تھی کہ ایسے تہذیب کے رکھوالے بھیڑیا صفت انسان نما جانور دنیا کی رہبری کے لیے بے چین ہیں، جن کی تاریخ بھی ایسی گندی اور ظلم وجور سے بھری پڑی ہے کہ قلم نقل کرتے ہوئے کانپ کانپ جاتا ہے، اور دل دہل دہل جاتے ہیں۔

مثلاً عیسائیوں نے اپنی عدالت کا نام ''روحانی عدالت'' رکھا ہے، مسلمانوں کو زندہ جلائے جانے کیا اس رسم کو انہوں نے ''عمل ایمانی'' رکھا تھا۔ یہ حضرات مسلمانوں کو زندہ جلا نے کا جواز اپنی آسمانی کتاب انجیل سے پیش کرتے تھے، انجیل کی یہ آیت ہے کہ ''اگر کوئی آدمی میرے مطابق زندگی نہیں گذارتا، تو وہ ایک ٹہنی کے مانند پھینکا جاتا ہے جو کہ مرجھا گئی ہے، اور لوگ اسے اکٹھا کر لیتے ہیں، آگ میں ڈالتے ہیں اور وہ جل جاتی ہے''۔ (یوحنا، باب نمبر ۱۵/آیت نمبر ۶)۔۔۔(Carina) کیرنیا نامی عدالت روحانی کا اہلکار اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''چوں کہ آگ میں جلنے کی موت سب سے زیادہ ہولناک ہے اس لیے یہی طریقہ اپنانا پڑا، اگر کوئی سزا اس سے زیادہ ہولناک اور اذیت ناک ہوتی تو یقیناً وہی تجویز کی جاتی''۔ جب مسلمانوں کو اس طرح صلیب پر زندہ جلا کر خاکستر کیا جاتا تو ان کی خوب خوب تذلیل کی جاتی، صلیبی مسلمان کی نعش پر تھوکتے، کنکریاں مارتے، جب آگ شعلہ

زن ہوتی اور گرم گرم شعلے مسلمانوں کے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے تو وہ قہقہہ لگاتے، اگر اتفاق سے کوئی احتجاج کی آواز اٹھاتا تو فوراً اسی جگہ اس کو بھی آگ میں جھونک دیا جاتا۔ الحجار نامی علاقے کے لوگوں سے دیکھا نہیں گیا، مجبوراً انہوں نے آواز احتجاج بلند کر ہی دی، اس کا نتیجہ ان کو یہ بھگتنا ہی پڑا کہ پانچ مہینے تک مسلسل ہر گلی کوچے خون کی ندیوں سے نہا اٹھے۔ ابن ابوجو مسلمانوں کا سرگرم رہنما تھا اس کو قتل کر کے اس کا سر غرناطہ کے مذبح کے دروازے پر تین سال تک لٹکائے رکھا۔

اب الحماس، الفتح تنظیمیں اگر سرگرم عمل ہیں تو ان کی کیا خطا ہے، کیا انجیل سے ثابت ہونے والا یہ مذہب دہشت گرد ہے یا فتح مکہ کے موقع پر جانی دشمنوں کو معاف کرنے والا۔ اسلام سچ ہے کہ اسلام کی زندگی کا سفینہ ساحل پر پہونچانے والا ہے اور زندگی اور وقت کو معتدل انداز میں گذارنے کا سلیقہ سکھاتا ہے، یہی عالمی مذہب ہے، اسی کو اختیار کرنا عقل مندی کی دلیل ہے۔

مدارس اسلامیہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی نظر میں

ہم کو یہ صاف کہنا ہے کہ عربی مدرسوں کی جتنی ضرورت آج ہے، کل جب ہندوستان کی دوسری شکل ہوگی، اس سے بڑھ کر ان کی ضرورت ہوگی، وہ ہندوستان میں اسلام کی کی بنیاد اور مرکز ہوں گے۔ لوگ آج کی طرح کل بھی عہدوں اور ملازمتوں کے پھیر اور ارباب اقتدار کی چاپلوسی میں لگے ہوں گے اور دیوانے ملا آج کی طرح کل بھی ہوشیار ہوں گے اور رہیں گے۔

اس لیے یہ مدرسے جہاں بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، ان کو سنبھالنا اور چلانا مسلمانوں کا سب سے بڑا فریضہ ہے، ان عربی مدرسوں کا اگر کوئی دوسرا فائدہ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ یہ غریب طبقوں میں مفت تعلیم کا ذریعہ ہیں اور ان سے فائدہ اُٹھا کر ہمارا طبقہ کچھ اور اُونچا ہوتا ہے اور اس کی اگلی نسل کچھ اور اُونچی ہوتی ہے اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ (مولانا سید سلیمان ندویؒ)

قسط۴

امام ابوحنیفہؒ اور ان کی فقہ

الشیخ محمد سلیمان شمسی
سابق شیخ الحدیث جامعہ اکل کوا

معاملات:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دائمی عادت تھی کہ اہل وعیال پر جتنا خرچ کرتے تھے اسی مقدار میں صدقہ بھی کیا کرتے تھے، اور جب کبھی نیا کپڑا پہنتے تو اسی قیمت کے برابر علماء و مشائخ کو پہناتے تھے، جب ان کے سامنے کھانا کھایا جاتا، تو جس قدر کھاتے اس سے دگنی مقدار میں فقیر کو دیتے تھے، رزق کے معاملے میں اس درجہ محتاط تھے کہ ہر مشتبہ چیز سے انتہائی پرہیز کیا کرتے تھے۔

ایک بار کوفہ میں ایک شخص کی بکری گم ہوگئی، تو لوگوں سے پوچھا کہ بکری کتنے برسوں تک زندہ رہتی ہے، تجربہ کاروں نے بتایا کہ اس کی انتہائی عمر سات برس ہے، تو آپ نے سات سال تک بکری کا گوشت نہیں کھایا، ایک مرتبہ اپنے وکیل کو مال فروخت کرنے کے لئے باہر بھیجا، مال کا ایک حصہ عیب دار تھا، آپ نے سخت تاکید کر دی کہ جس کسی کے ہاتھ مال فروخت کرنا، اس کو عیب سے آگاہ کر دینا، مگر وکیل کو یاد نہ رہا، ظاہر کئے بغیر مال کو فروخت کر دیا اور پورے مال کی قیمت وصول کر کے واپس آیا، تو آپ نے احتیاطاً پوچھا کہ خریدار کو عیب سے آگاہ کیا تھا یا نہیں؟ وکیل کو اب ہوش آیا اور کہا کہ مجھے یاد نہ رہا تھا اور عیب بتائے بغیر کل مال فروخت کر دیا آپ نے پورے مال کی اصول شدہ قیمت صدقہ کر دی جو تیں پینتیس ہزار درہم تھی۔

ایک بار سخت دھوپ میں اپنے ایک مدیون کے گھر تقاضا کے لئے گئے، تو باہر دھوپ میں کھڑے رہے، اس کی گھر کی دیوار کے سایہ سے بھی فائدہ اٹھانا گوارہ نہ کیا۔

صدق معاملہ میں ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ضرب المثل تھے، اگر ناتجربہ کار لوگ اپنا مال فروخت کرنے کے لئے ان کی دکان پر لے آتے اور بازار بھاؤ سے کم قیمت بتاتے تو آپ

ان سے فرماتے کہ تمہارا یہ مال اس سے زیادہ قیمت کا ہے جو تم بتلا رہے ہو اور پھر صحیح قیمت پر مال خریدتے۔ ایک مرتبہ ایک بڑھیا ریشمی تھان خریدنے کے لئے آپ کی دکان پر آئی، آپ نے ایک تھان دکھلایا، تو اس نے کہا میں ایک بوڑھی عورت ہوں مجھے کچھ تجربہ نہیں ہے، آپ کو تھان جتنے میں پڑا ہوا تنی قیمت میں دے دیجئے۔ آپ نے فرمایا چار درہم میں لے لو، اس نے کہا مجھ بڑھیا سے تمسخر نہ کیجئے، آپ نے فرمایا دو تھان ایک ساتھ میں نے خریدے تھے، ان میں سے ایک تھان نفع کے ساتھ بیچا ہے، اب یہ تھان صرف چار درہم میں پڑ رہا ہے، چناں چہ آپ نے چار درہم میں وہ تھان دے دیا۔

ایمان ویقین:

ایمان ویقین کا یہ عالم تھا کہ بجز خدا کے کسی سے ذرّہ برابر خوف نہ کھاتے تھے، حضرت عبداللہ ابن مبارک چشم دید واقعہ بیان فرماتے ہے کہ ابوحنیفہؒ ایک دن کوفہ کی جامع مسجد میں تھے کہ چھت سے ایک سانپ گرا، اور ان کی گود میں پڑا، لوگ خوف زدہ ہو کر بھاگے، مگر ابوحنیفہؒ اپنے جگہ اسی ہیئت میں بیٹھے رہے اور سانپ کو اس طرح جھٹک دیا جیسے رسی جھٹک دی جاتی ہے۔

ذہانت وفطانت:

عقل وفہم کے معاملہ میں فیاض ازل نے پوری فیاضی کا معاملہ فرمایا تھا، باریک سے باریک مسائل اس آسانی سے حل کر دیا کرتے تھے کہ معاصرین دنگ رہ جاتے اور بسا اوقات سوءِ ظنّی میں پڑ جاتے، لیکن جب آپ کے دلائل سنتے تو سرِ تسلیم خم کر دیتے، آپ کی ذہانت کے بہت سے واقعات ہیں جو آپ کے حالات وسوانح میں محفوظ ہیں۔

دینی مدارس کا فیض

دینی مدارس ایک بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں، عام لوگوں میں نماز، روزہ کا جو چرچا ہے، مساجد میں جو رونق ہے، دیہات اور قصبات میں جس قدر لوگ اسلام سے آشنا ہیں، سب انہیں مدارس کا فیض ہے۔ (مولانا شبلی نعمانیؒ)

جلّ جلاله